قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ـــ لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ ـــ ۵۴۶۶۰

ٹیلیفون: ۸۷۶۲۱۹

فہرستِ مضامین

جشنِ آزادی	ادارہ	۲
لمعات	ادارہ	۴
اصل انحطاط کہاں ہے؟	حافظ محمد یعقوب تاجیک	۹
اسلامی معیشت کا بنیادی فلسفہ	علی محمد چدھڑ	۱۲
مملکتِ پاکستان کے برسرِ اقتدار لوگو	محترمہ بلند اختر	۲۴
کاروانِ زندگی بے منزل است	ادارہ	۲۵
آزادی سے فرار	عاطف طفیل	۲۶
حقائق و عبر	ادارہ	۳۳
نقد و نظر	ادارہ	۴۰
رپورٹ بزمِ اوسلو	بزمِ اوسلو	۴۵
اے کاش	ایم ایم بخاری	۴۸
سابق روس کی آزاد مسلم ریاستیں	ملک حنیف وجدانی	۶۰
اک شمع اور بجھی	ادارہ	۶۱
بچوں کے صفحات	علامہ غلام احمد پرویزؒ	۶۲
فہرست وڈیو کیسٹس	ٹرسٹ	۶۴
اسقاطِ حمل (آخری قسط)	ڈاکٹر سید عبدالودود	۸۰

مجلسِ ادارت

مدیرِ مسئول: محمد لطیف چوہدری

معاون: ثریا عندلیب

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

ناشر: عطاء الرحمٰن آرائیں

طابع: سید عبدالسلیم

مطبع: آفتاب عالم پریس

۱۲ ہسپتال روڈ، لاہور

فون ۷۲۷۳۹۲

مقامِ اشاعت: ۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

جلد ۴۶ ـــ اگست ۱۹۹۳ء ـــ شمارہ ۸

بدلِ اشتراک

سالانہ

پاکستان ـــ ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک ـــ ۱۸ امریکی ڈالر

فی پرچہ: ۱۰/- روپے

جشنِ آزادی

(۱۴ اگست ۱۹۹۳ء)

اس میں شُبہ نہیں کہ قوموں کی زندگی میں بعض واقعات ایسے آتے ہیں جن کی یاد قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن "یاد" کوئی بُت نہیں ہوتی کہ اس کی پرستش کی جائے۔ یہ ذریعہ ہوتی ہے شعورِ ملی میں اس انقلاب کو تازہ رکھنے اور آگے بڑھانے کا جس کی یاد قائم رکھی جاتی ہے۔ مسلمانانِ ہند کی ملی زندگی میں اسی قسم کا ایک انقلاب آفریں دن آیا جسے ہم یومِ آزادی کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ دن درحقیقت ایک حدِ فاصل تھا ہماری گذشتہ اور آئندہ زندگی میں۔ یہ دن تھا اس عہد کا کہ ہماری آنے والی زندگی گذشتہ زندگی سے یکسر مختلف ہوگی۔ ہماری گذشتہ زندگی تھی غیروں کے بنائے ہوئے نظام کے تابع چلنے کی۔ وہ نظام جو موجب تھا ہمارے اخلاقی تسفّل اور تعلیمی تنزّل کا۔ جس نے ہمیں انسانیت سے یکسر بے بہرہ بنا رکھا تھا۔ جس نے انسانوں کی دنیا کو درندوں کا بھٹ بنا رکھا تھا۔ جس میں ہر سرمایہ دار غریبوں کی محنت کے اثمار و نتائج پر سانپ بن کر بیٹھا رہتا تھا۔ جس میں مزدوروں کے خون کی سُرخی اربابِ ثروت کے عشرت کدوں کی رنگینی کا سامان فراہم کرتی تھی۔ جس میں غریبوں کی ہڈیاں امرار کے قصرِ تعیش کے لئے چونہ بنتی تھیں۔ وہ نظام جس نے ہمیں انسانیت سے بہت نیچے گرا کر حیوانیت کی سطح پر لا کھڑا کیا تھا۔ بلکہ اس سے بھی نیچے۔ دو لفظوں میں یوں کہیئے کہ وہ نظام جس نے ہمیں خیر و برکت کے سرچشمۂ ابدی (ذاتِ خداوندی) سے بہت دور پھینک دیا تھا۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کا دن اس اعلان کا دن تھا کہ

جاء الحق و زھق الباطل

وہ انسانیت سوز نظام ختم ہوا اور اب اس کی جگہ ایک نئے نظام کا دَور شروع ہوا جس کا سرنامہ "احترامِ آدمیت" ہے۔ کسی کو اس اعلان پر شُبہ ہو تو ہو، لیکن یہ حقیقت ہے کہ قوم نے اس اعلان کو بالکل ایسا سمجھا تھا۔ اس نے دس سال اسی "اعلان" کی خاطر جدوجہد کی تھی، ہم نے اپنے دعوے کی بنیاد اسی اعلان پر رکھی تھی اس لئے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کا دن اسی اعلانِ اعلام کا دن تھا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو اس کی پہلی سالگرہ منائی تھی۔

ہم کسی تفصیل میں الجھے بغیر، پاکستان کے اصاغر و اکابر سے خدا کے نام پر پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا فی الواقعہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کا دن تمہاری پہلی اور بعد کی زندگی میں حدِ فاصل بن گیا تھا اور کیا اس کے بعد ان چھیالیس برسوں میں تم نے اس حد سے دو قدم آگے بڑھائے ہیں؟ اس کا جواب باہر سے نہ مانگئے، خود اپنے دل سے مانگئے۔ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (۱۷/۱۴)۔ اپنا اعمالنامہ پڑھ — کہ یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے — اور پھر کسی اور سے **شہادت طلب** نہ کر، بلکہ اپنے آپ سے پوچھ کہ آج خود تیری ذات تیرے محاسبہ کے لئے کافی ہے۔ نفس محاسبہ کر اور پھر سوچ کہ کیا تیری غیرت گوارا کرتی ہے کہ تو اس مزعومہ "حدِفاصل" کی یاد میں جشنِ مسرت منائے؟ اگر آپ کا دل فی الواقعہ گواہی دیتا ہے کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کا دن، ہماری زندگی میں ایک حدِ فاصل بن گیا تھا اور اس کے بعد ہم اس حد سے برابر آگے بڑھے جا رہے ہیں تو آپ کو زیب دیتا ہے کہ اس دن کی یاد میں چراغاں کیجئے، جشن منائیے، ساری دنیا کو اس انقلابِ عظیم پر دعوتِ فکر و نظر پیش کیجئے۔ اپنی آنے والی نسلوں کے سامنے سر اٹھا کر چلئے۔ لیکن اگر آپ کا دل اس کی گواہی نہیں دیتا تو اپنے آپ کو دھوکہ میں نہ رکھئے کہ یہ دھوکہ تمہیں اپنوں اور بیگانوں سب کی نظروں میں ذلیل کر دے گا۔

ہے کوئی خدا کا ایسا بندہ جو اپنے دل کی سچی سچی گواہی کو ۱۴ اگست کے دن ساری ملت کے سامنے اعلانیہ پیش کر دے!

تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

گذشتہ ماہ سیاسی میدان میں وطنِ عزیز میں ایک طرف برق رفتاری سے تبدیلیاں ہوتی رہیں اور دوسری طرف ان تبدیلیوں کی وجہ سے وقت اور زندگی اس قدر سست رفتار معلوم ہونے لگی کہ اگلے دن کے اخبار کے آنے تک الجھن ہونے لگتی تھی کہ خدا جانے اس درمیان کیا کچھ نہ ہو گیا ہوگا ـــــ اگرچہ یہ انقلاب تو نہیں مگر اس صورتحال پہ فراقؔ کا یہ شعر ضرور صادق آتا ہے،

دیکھ رفتارِ انقلاب فراقؔ کتنی آہستہ اور کتنی تیز

بے یقینی کی کیفیت صبر آزما اور اعصاب شکن ہوتی ہے اور یہ کیفیت مسلسل سارے ملک پہ ساری رہی، بارہا جی میں آیا ارباب اختیار سے اس مقدس سرزمین کا واسطہ دے کر کوئی اپیل کی جائے۔

کوئی کتنا بھی بڑا، کتنا بھی طاقتور، کتنا بھی امیر، کتنا بھی بڑا صاحبِ اقتدار کیوں نہ ہو آخر فانی ہے اور اس کے جانے کے بعد تاریخ اپنا فیصلہ سنا دیتی ہے اور تاریخ کبھی رو رعایت نہیں کرتی، فرعون آج بھی جائے عبرت ہے اور سکندر کے خالی ہاتھ آج بھی ضرب المثل ہیں،

ارادہ یہی تھا کہ ایک بار پھر اربابِ اختیار کو اس وطنِ عزیز کے معرضِ وجود میں لانے کے پس منظر کو دہرایا جائے، اقبالؒ اور جناحؒ کی جدوجہد کا واسطہ دیا جائے، اس بے قصور مخلوق کے مستقبل کی دہائی دی جائے جو اس خطۂ زمین میں بستی ہے اور جو اپنی آئندہ نسلوں کے لئے امن اور خوشحالی کے خواب رکھتی ہے،

مگر یہ سوچ کر کہ قارئین تک پہنچنے کے لئے ایک ماہ کا عرصہ درکار ہے اور ایک ماہ کا وقفہ گاہ تیس اور گاہ اکتیس دن ہوتا ہے، خدا جانے کیا سے کیا ہو جائے اور ہماری باتیں آؤٹ آف ڈیٹ ہو کر غیر متعلقہ ہو جائیں ہم نے یہ ارادہ ترک کر دیا اور پھر اس پس منظر پہ ہم پہلے بھی بارہا روشنی ڈال چکے، بارہا ہم نے یہاں بسنے والوں کی آرزوؤں، تمناؤں اور خوابوں کی بات کی مگر ایوانہائے اقتدار میں ہمارے ہاں بس زور اور غلبہ ہی سکہ رائج الوقت ہے،

سیاست کو معاشرت اور معیشت سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا' معاشرت اور معاشرتی اقدار کلی بہت اہم ہیں مگر معیشت بہر حال بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔

معاشی خوشحالی یا بدحالی کے معیار بھی اس دور ہیں عجیب میں اور اس کے پیما[ـنے] (ہمارے) سمجھ سے تو باہر ہیں۔ — کسی بھی ملک کی معاشی حالت کے لئے فی کس آمدنی کا حوالہ دیا جاتا ہے اور یہ حوالہ بڑا ہی ERKATI[illegible] اور دھوکے میں رکھنے والا حوالہ ہے' یہ تو بس اوسط نکالنے کا قصہ ہے جس میں ایک طرف کروڑوں اور اربوں کمانے والے بھی ہوتے ہیں اور دوسری طرف' نانِ جویں کے محتاج بھی' سب کی آمدنی جمع کر کے تعداد پہ تقسیم کر کے اوسط نکال لیتے ہیں اور بس! اس سے رپورٹوں کا پیٹ تو بھر جاتا ہے بھوکے انسانوں کے پیٹ نہیں بھرتے' اربوں کمانے والے کی بھی اوسط آمدنی وہی ہوتی ہے جو ایک نادار شخص کی۔

تقابل کی نیت سے نہیں مگر یہاں اپنی تاریخ کا ایک مشہور واقعہ دہرانا بے جا نہ ہوگا۔ واقعہ ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا۔

خلافت سے پہلے آپ تجارت کرتے تھے اور اچھے خوشحال تھے' خلافت کی ذمہ داریوں نے آپ کا سارا وقت لے لیا' تو آپ نے حضرت عمرؓ کی تجویز اور دیگر صحابہؓ کے مشورہ سے بیت المال سے وظیفہ لینا قبول کر لیا۔

جب یہ سوال زیرِ غور تھا کہ خلیفۃ المسلمین کا وظیفہ کیا ہونا چاہیئے' تو حضرت صدیقؓ نے دریافت فرمایا کہ مدینہ میں ایک مزدور کی کم از کم روزانہ اجرت کیا ہے' وہی اجرت آپ نے اپنے لئے بطور وظیفہ مقرر کر لی' رفقاء میں سے کسی نے آپ سے کہا اتنے کم روپے میں آپ کا گزارا کیسے ہوگا؟ تو آپ نے فرمایا کہ اسی طرح جس طرح اس مزدور کا گزارا ہوتا ہے اور اگر نہ ہوا تو میں اس مزدور کی اجرت بڑھا دوں گا تاکہ اس طرح میرا وظیفہ بھی بڑھ جائے' جوں جوں مزدور کی اجرت بڑھتی جائے گی میرا معیارِ زندگی اسی نسبت سے بلند ہوتا جائے گا —

ہمارے نزدیک یہ محض ایک واقعہ نہیں' معیشت کا ایک فلسفہ ہے' نچلے طبقوں کا معیار بلند کرتے چلے جائیں' یہ معیشت کی استواری کے لئے وسیع اور ٹھوس بنیاد بنے گی اور اس طرح ساری ملت میں خوشحالی یکساں طور پر پھیلتی چلی جائے گی' دولت معاشرے میں یوں گردش کرے گی جیسے جسم میں خون' ہمارے سرمایہ دارانہ معاشرے کی طرح وقت گزرنے کے ساتھ امیر امیر تر اور غریب غریب تر نہ ہو جائیں گے اور امیر ترین چند خاندانوں کی بدولت اوسط آمدنی کا بڑھنا قوم کی خوشحالی نہیں سمجھی جائے گی۔

آج اپنے بڑے بڑے شہروں پہ نگاہ ڈالیں' تو شاہراہوں پہ بلند قامت پلازے' نئی آبادیوں میں وسیع و عریض محلات نما بنگلے نظر آتے ہیں' نئی مارکیٹوں میں جگمگاتی ہوئی دکانیں مال و اسباب سے بھری نظر آتی ہیں بلکہ مال و اسباب سے اُبلتی ہوئی نظر آتی ہیں' انہی شہروں میں شریف و غریب لوگوں کو سر چھپانے کے لئے ٹھکانہ ملنا اس حد

تک دشوار ہے کہ اس کے لئے بہت سے ضروری اخراجات کی قربانی دینی پڑتی ہے، جو لوگ ابھی تک باپ دادا کے بنائے مکانوں میں گزر اوقات کر رہے ہیں وہ کس تنگی میں گزارا کرتے ہیں، یہ اگر کوئی سروے کرے تو معلوم ہو فی کمرہ کتنے انسان بس رہے ہیں ——

یہاں بھی مشکل انہی لوگوں کے لئے ہے جو غیر قانونی اقدام نہیں کرتے نہیں کرنا چاہتے یا نہیں کر سکتے، جو لوگ غیر قانونی قبضہ کر کے کچی آبادیاں بنا لیتے ہیں وہ وقت کے ساتھ ساتھ ان جگہوں کو اپنی ملکیت بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ قانون شکنی (بر بنائے مجبوری ہی سہی) کی اس حوصلہ افزائی کی مظہر شہروں کی وہ کچی آبادیاں ہیں جہاں بغیر کسی پلاننگ کے گھر بنے ہوتے ہیں۔

نچلے اور محروم طبقے کے لوگوں کا گزر جب ان محلات والے علاقوں اور جگمگاتی دکانوں والی مارکیٹوں سے ہوتا ہے تو ان کے دلوں میں ایک طرف جو طوفان اٹھتے ہیں اور دوسری طرف جو مایوسی پیدا ہوتی ہے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے

راہ چلتے ہوئے شوکیسوں کو دیکھا نہ کرو
کرب ہی کرب لئے لوٹ کے گھر جاؤ گے

اسی کیفیت کا غماز ہے۔

یہ تو حالت ہے شہروں کی، گاؤں کا کیا ذکر، وہاں تو ابھی تک صدیوں پرانے طبقات میں بٹا معاشرہ قائم ہے، کچھ زمیندار ہیں باقی کمی کمین —— کچھ مترفین اور باقی محنت کش۔

جمہوریت کے اس دور میں سیاسی جماعتوں نے عوام کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے انہیں ان کے حقوق و فرائض سے آگاہ کرنے کے بجائے یک طرفہ طور پر بہت سبز باغ دکھائے اور سیدھے سادے چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے کے قائل قانع اور صابر لوگوں کے دلوں میں بھی بغیر محنت کے خوشحالی کا لالچ ابھارا ——

اور انہوں نے برسر اقتدار طبقوں کی طرف دیکھا جہاں انہیں دولت کی ریل پیل نظر آئی، سرکاری افسروں کی طرف دیکھا جنہیں بے حد و حساب اختیارات حاصل ہیں، —— دونوں تک رسائی کے لئے، دونوں کے قرب کے لئے انہیں ایک ہی اسم اعظم ملا، دولت، اور وہ اسے حاصل کرنے کے پیچھے لپک پڑے اور اس دوڑ میں انہیں کیا کیا سہنا اور کیا کیا کچھ قربان کرنا پڑا یہ ناگفتنی ہے۔

ہم بہتری کے لئے جدوجہد کے مخالف نہیں مگر ہمارے ہاں خوشحالی جن راہوں سے آئی ہے اور جن طبقوں تک آئی ہے وہ کسی سے ڈھکے چھپے نہیں، جائز و ناجائز، درست اور غلط کی تمیز اب قصۂ ماضی بن چکی، شرافت بزدلی کے مترادف ہوئی، درست راستوں پر چلنا کمزوری کے مترادف سمجھا جا رہا ہے۔

تعلیم کی بات چھوڑیئے ملک میں خواندگی کی شرح مایوس کن حد تک کم ہے، اس لحاظ سے ہم دنیا کے پسماندہ ترین ملکوں میں سے ہیں، ایسے میں ذہن کو وسعت اور جلا بخشنے والے مطالعے کا موقع چند گنے چنے لوگوں ہی کے حصّے میں آتا ہے، عام پڑھے لکھے نوشت و خواند تک محدود ہیں وہ لوگ بھی جنہیں ہم ڈگری یافتہ کہتے ہیں ان میں بھی بمشکل دس فی صد ایسے لوگ ہوں گے جنہیں کورس کی کتابوں کے علاوہ بھی مطالعے کا شوق ہے۔

—— اور پھر ہمارے آجکل کے ذرائع ابلاغ ہیں، اخبار، ریڈیو اور خاص طور پر ٹیلیویژن کو بڑا مان ہے کہ وہ بیداری کو دور دور تک پھیلا رہے ہیں مگر غور کریں تو یہ علم و آگہی کا پھیلاؤ نہیں سطحی اطلاعات کی فراہمی ہے۔

اشتہاری کمپنیاں ہر پروگرام کو سپانسر کرنے کے ناطے اس سارے میڈیم پہ چھائی ہوئی ہیں، بنی سنوری لڑکیاں، دل لبھانے والے انداز میں، کپڑوں کے پرنٹس اور چائے، آئس کریم، چاکلیٹ، بسکٹوں، صابنوں، کریموں، خوشبوؤں، ٹوتھ پیسٹوں، مشروبات کے اشتہاروں بلکہ ایئر لائن اور بینکوں تک کے اشتہاروں میں جلوہ گر نظر آتی ہیں —— ان اشتہاروں کے بل پر ماڈل گرلز کا نیا طبقہ وجود میں آگیا ہے، دوسرے ملکوں کی کھلے عام نقالی ابھی نہیں ہو سکتی کہ اپنے کلچر اور مذہب اور مذہبی عناصر کا ڈر ایک ایسا طبقہ بھی ہے جو ہماری باتوں کو پسماندگی سمجھتا ہے اور ساری رکاوٹوں کو ہٹا کر کھل کھیلنے کا تمنائی ہے، سب پردوں کو اٹھا دینے کو روشن خیالی کا نام دیتا ہے، ڈش انٹینا نے ان کے لئے یہ مسئلہ حل کر دیا ہے —— اب، پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ، کہنے کے تکلف کی بھی ضرورت نہیں۔

سرمایہ دار معاشرے میں یہ سب کھونٹی کے ساتھ لگی مچھلیوں کی مثال ہیں جس سے یہ کمپنیاں مصنوعی ضرورت پیدا کر کے اپنے مال کے لئے گاہک پیدا کرتی ہیں چاہے ان میں بلا ضرورت خریداری کی ہوس اکساتی ہے،

اس کے علاوہ نقصان اس سے یہ ہوا کہ اس نے لوگوں سے وقت چھین لیا ہے، سوشل ملاقاتیں ختم ہوئیں جن میں تبادلۂ خیالات ہوتا تھا، باہمی مسائل پر بات چیت ہوتی تھی، اس نے پڑھنے والوں کے ہاتھوں سے کتاب چھین لی —— اب گھروں میں کتابوں کی لائبریریوں کی بجائے کیسٹوں کا ذخیرہ نظر آنے لگا جس میں ڈرامے ہیں، گانے ہیں، جوکس (مزاح) ہیں، فلمیں ہیں اور بس!

اخبارات سنسنی خیزی کے علاوہ انہی اشتہارات کے طفیل بزنس کر رہے ہیں،

ہر چیز بزنس ہو گئی ہے، اوپر اوپر سے دعوے تو بڑے کئے جاتے ہیں، اپنے اخبارات و جرائد کو مشن کہہ کر آگے بڑھایا جاتا ہے مگر در اصل یہ سب تجارت ہے، اس دور میں علم و ہنر بے توقیر اور مال و دولت، اختیار و اقتدار معتبر ہو گئے ہیں۔ ہمارے ہیرو بدل گئے ہیں۔

رسائل تو اب رہے ہی نہیں، ہیں تو سطحی اور چلتے سے موضوعات پہ مشتمل صفحات کے علاوہ انہی اشتہاروں سے مزین، اچھے معتبر اداروں کے ہفت روزہ رسائل کے درمیانی آٹھ دس صفحے لباس کی نئی سے نئی تراش خراش، نئے سے

نئے فیشن اپنائے انہی ماڈل گرلز کی نمائش پر مشتمل ہوتا ہے، خوبصورت میک۔اپ، خوبصورت لباس، خوبصورت چال ڈھال، سوشل ملاقاتوں کی تصاویر بھی یہی رنگ، ڈھنگ اور نمود و نمائش کا اشتہار ہوتی ہیں، سادہ لباس، سادہ زندگی اور بلند سوچ SIMPLE LIVING AND HIGH THINKING قصۂ پارینہ ہو چکا۔

اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ یہ خطہ جو پاکستان بنا قدرتی طور پر خوبصورت سرزمین ہے، یہاں کے رہنے والے خوش شکل اور صحت مند لوگ ہیں، دنیا کی کسی محفل میں ہوں نمایاں نظر آتے ہیں مگر اس وقت ہم، ہمارے ذرائع ابلاغ خود کو بس خوش شکل، خوش لباس اور خوش خوراک قوم کے طور پر آگے بڑھا رہے ہیں، علم و ہنر میں، طبیعات اور کیمیا میں اور سائنس کے دوسرے شعبوں میں ہم نے ان پینتالیس سالوں میں کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے اس سلسلے میں ہم خاموش ہیں کیونکہ ہمارے پاس دنیا کو بتانے کے لئے کچھ ہے ہی نہیں ــــــ

کھانا پینا، سامانِ عیش و عشرت بہم پہنچانا اور اسی کو زندگی سمجھنا دراصل حیوانی سطح کی زندگی ہے اور جب انسان حیوانی سطح پہ آجائے تو حیوان سے بھی فروتر ہو جاتا ہے، اسی لئے قرآنِ پاک ایسی زندگی کو کفر کی زندگی کہتا ہے۔ (۱۲/۴۷)۔ بہتر کھانا پینا ممنوع نہیں (صرف ضائع کرنا بُرا ہے) زیب و زینت پہ پابندی نہیں، مگر انہی کو زندگی کا محور بنا لینا ساری تگ و دو صرف انہی تک محدود کر دینی، کھانے پینے اور سامانِ عیش و عشرت ہی کو زندگی کا منشا سمجھ لینا، جانوروں جیسی زندگی ہے، کفر کی زندگی ہے، انسانیت کی زندگی بلند تر اقدارِ حیات سے عبارت ہے ــــــ

یہی اقدارِ حیات ہیں جو انسانوں کی خواہشوں کو ساحلوں کے اندر رکھتی ہیں، موجوں کو بے قابو ہو کر کناروں سے اچھلنے نہیں دیتیں، حلال و حرام کی تمیز سکھاتی ہیں، زندگی کو نکھارتی اور سنوارتی اور اسے صحیح راستے (صراطِ مستقیم) پہ گامزن کرتی ہیں ــــــ اور یہ اقدار ہمیں قرآن پاک ہی سے مل سکتی ہیں۔

التماس

نمائندگانِ بزم سے التماس ہے کہ وہ اپنے پیشگی کھاتوں کی طرف توجہ فرمائیں اور خبرنامہ میں اٹھائے گئے امور سے متعلق ناظمِ ادارہ سے رابطہ قائم کریں۔

(حافظ) محمد یعقوب تاجیک

اصل انحطاط کہاں ہے؟

اصل انحطاط کہاں ہے، زوال کا باعث کون ہے، محاصرہ بالفعل کس کا ہے، یہ سوالات ایسے ہیں کہ کوئی نہیں ان کو اٹھاتا۔

اوّل تو سوالات ہی ایسے ہیں کہ ان کا اصل جواب کسی کے پاس ہوتا نہیں اور اگر کسی کے پاس ہوتا ہے تو وہ جواب دینا پسند نہیں کرتا کیونکہ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ ہوا زدگی کے اس عالم میں اس قسم کی بات کرنا بے سود ہے۔ اور دوسرا اس طرح کے سوالات اور ان پر فتوے اتنے زیادہ ہیں کہ کسی ایک پر آنے یا دعوے سے کچھ کہنے کی نوبت نہیں آتی۔

مثال کے طور پر یا برسبیلِ تذکرہ اگر یہی سوال میں آپ سے پوچھوں کہ بتایئے اصل انحطاط کہاں ہے اور میرے ملک کے زوال پذیر ہونے کی اصل وجہ کیا ہے تو آپ میں سے اکثر [چند روایتی موضوعات کو سامنے رکھ کے] یہی جواب دیں گے کہ رشوت عام ہو گئی ہے، افسر کمیشن خور بن گئے ہیں، صنعت کار نے منافع کی شرح چار گنا بڑھا دی ہے، لوگوں نے نماز پڑھنا چھوڑ دی ہے، حکومت جعل ساز بن گئی ہے، مولوی مفتی زکوٰۃ کھاتے ہیں، سیاسی جماعتیں کھالیں بیچتی ہیں، اسمبلی والے مفاد کے قانون بناتے ہیں، سرمائے والے قومی بینکوں کا مال کھاتے ہیں، عقیدوں والے لونڈی غلام کی بات کرتے ہیں، پیسے والے عیاشی کرتے ہیں اور ..... جب اتنی خرابیاں ایک جگہ پر اکٹھی ہو رہی ہوں تو آفات سے بچاؤ کیسے ممکن ہے۔

آپ کی بات اگر مان لی جائے کہ ہاں یہی ہیں وہ خرافات جن کی وجہ سے ملکی معاملات کی حالت درست نہیں رہی تو پھر فوری طور پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اچھا بھلا ملک تھا جسے قائداعظمؒ نے ہمارے لئے بنایا اور اچھے بھلے لوگ تھے جنہوں نے اس ملک کی سلامتی کے لئے زندگیاں دیں پھر یہ خرابیاں پیدا کیسے ہوئیں؟ زوال کا باعث بنا کون؟

ظاہر ہے زوال باہر سے نہیں آیا۔ یہ نفسوں کے اندر سے پیدا ہوا ہے اور اس کی علت اور تسبیب ہمیشہ جذب پرستی رہی ہے۔ مستند اختیار اور وحشیانہ طرزِ عمل رہا ہے جو بڑی حویلیوں اور بُرج نما دیواروں کی اندرونی سطح پر قائم ہوا ہے اور جو مختلف سمتوں کی طرف بڑھتے ہوئے امن عامہ میں انتشار پیدا کر گیا ہے۔

عوضی اور خود آوردہ لوگ جو ان حویلیوں، داروں، حجروں اور ان کے خلوت خانوں میں پروان چڑھے ہیں اور جن کو انگریزی پبلک سکولوں، ایچی سن کالجوں اور آکسفورڈ، کیمبرج درسگاہوں میں انگریز کا علم سکھایا گیا ہے، ان کے ذہنوں میں ایک ایسے نظریے کی رٹائی کرا دی گئی ہے کہ غیر آئینی اقتدار ان کا نصیبہ ہے اور یہ نصیبہ اس رب کی طرف سے انہیں عطا ہوا ہے جس رب کی طرف سے غریبی غریبوں کو اور غلامی غلاموں کو نصیب ہوئی ہے۔

یہ کفاف [LIVELIHOOD] یہ ظل [SHADOW] یہ مچان [A RAISED SEAT] ان کو ملی کہاں سے؟ سرچشمہ کیا ہے؟ ضمانت اس کی ان کو کس نے دی؟

جاگیر نے۔ آباد اور غیر آباد علاقوں کے ناجائز قبضہ نے۔ غریبوں کی بے مقدوری نے۔

اور یہ جاگیر ہی تھی اور جاگیر ہی ہے جہاں کے مغلوب انسانوں کے ووٹ سے یہ صوبائی اور قومی اسمبلی میں پہونچے ہیں۔ جہاں سے ممبروں پر اثر انداز ہو کے قانون کے مسوّدے پاس کرائے ہیں۔ جہاں سے یہ امیر اور پھر وزیر بنے ہیں۔ جہاں سے قومی مقاصد کے خلاف انہوں نے کام کئے ہیں اور ..... اور جہاں سے پیشہ وروں کی جماعت کی رکنیت انہوں نے اختیار کی ہے۔

کتنی ہے یہ جاگیر؟ کون ہیں اذن یافتہ جو وارث بنے ہیں؟ تصویر کا چھوٹا سا چوکھٹا میرے پاس ہے اس پر نظر آپ بھی ڈال لیں۔

— یہ جاگیر، یہ خطۂ اراضی [پاکستان کے صرف ایک علاقہ میں] گیارہ لاکھ پچاس ہزار ایکڑ ہے۔
— جاگیرداروں کی تعداد جن میں 'اعلیٰ' خاندان، سردار اور میر اور متعلقہ دیگر خاندان، خیرات دار اور اس کے اجزا و عناصر [سید، گدی نشین اور فضیلت کے خطاب یافتہ جو سرداری اور امارت کے تسلسل پر دعاگو ہوئے] ہندو، راجپوت، قبائلی اور بلوچی سردار، ایک سو چھبیس ہے۔
— تیس کے قریب ایسی جاگیریں ہیں جو باغوں اور رہائش گاہوں کے لئے مخصوص ہیں۔
— جاگیروں سے مالیہ کی رقم جو کروڑوں روپیہ بنتی ہے وصول نہیں ہوتی۔
— وارث ہمیشہ مرد ہی ہوتے ہیں۔

یہ صرف سندھ صوبے کی کٹی پھٹی تصویر ہے [صحیح خدوخال کا پتہ چلنا آسان نہیں] صوبہ پنجاب اور بلوچستان اور سرحد کی جاگیروں اور ان پر قابض گروہوں کی کیفیت اس سے مختلف نہیں۔ مخادمی زمینداری اور سرداری حقوق جو انگریزوں نے عطا کئے اور [علاوہ فوجی حاکموں مذہبی درسگاہوں ..... کے] جو زمین جنگلات پہاڑ اور کان کنی کے قطعات پر پھیلے ان کے کھاتوں اور قبضہ دخل کا بھی کسی کو پورا پتہ نہیں۔ کبھی کسی وقت ۱۹۵۲ء میں یا ۱۹۵۵ء میں یا پھر کسی اور سال میں ان جاگیروں کے ختم کرنے کے فیصلے اگر ہوئے تو وقت کے ساتھ وہ بھی معطل قرار پا گئے اور موروثی آبادیاں فرمانرواؤں کی گرفت میں اسی طرح قائم رہیں۔

لہٰذا معاشی بحران ہو یا اخلاقی پستی، اس کی اصل وجہ سردارانہ اور چودھریانہ غلبہ کی وہ ناپاک اور کج خلق ذہنیت ہے اور اس ذہنیت کے ساتھ وہ جھوٹے مذہبی فلسفے ہیں جن کے زیر اثر ایسی پالیسیاں مرتب ہوئیں جن سے ایک طرف ان کے بنائے ہوئے فرعونی راج کو تقویت ملی اور دوسری طرف عام لوگوں کی ناتوانی جو برطانیہ دور سے چلی آ رہی تھی دور نہ ہوئی۔

آج پاکستان کی سیاسی بے چینی اور ملکی بدنظمی کا وہ وقت ہے جو اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ فکر و عمل سے کام لیتے ہوئے قواعد و ضوابط [جن کی بنیاد پر قوم عاجز کر دی گئی ہے] کو یکسر بدل دیا جائے اور سرخیلوں، غارتگروں، سیاسی لوٹوں اور میروں کے جاہ و منصب پر آنے کے تمام دروازے بند کر دیئے جائیں۔

زمین اللہ کی ہے۔ الارض کا ذکر ۴۵۱ بار جو قرآن کریم کی آیات میں آیا ہے اس سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ زمین پر انفرادی تسلط کا نظریہ صریحاً غلط ہے۔

وہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں۔ تیری نہیں میری نہیں

تعلیم و تربیت

انٹرمیڈیٹ لیول تک کے طلبا و طالبات کے لئے لاہور میں گھریلو ٹیوشن کا انتظام ممکن ہے۔

ضرورتمند فون ۸۷۹۲۴۶ / ۸۷۶۲۱۹ پر رابطہ قائم کریں۔

علی محمد چدھڑ

اسلامی معیشت کا بنیادی فلسفہ

۲۹ مئی ۱۹۹۳ء کے روزنامہ "جنگ" میں مندرجہ بالا عنوان کے تحت مولانا ارشاد الحق صاحب تھانوی کا ایک کالم شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے ایک پروفیسر صاحب کے ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے جو انہوں نے کچھ عرصہ قبل مولانا صاحب کے کسی مضمون کے سلسلہ میں اٹھائے تھے۔ یہاں ان سوالات کی تفصیل دینے کی گنجائش نہیں البتہ قارئین تھانوی صاحب کے جوابات سے اخذ کر لیں کہ وہ سوالات کس نوعیت کے تھے۔

پروفیسر مذکور کا تنقیدی جائزہ تین سوالات پر مبنی ہے جن میں پہلے سوال کا جواب مولانا تھانوی نے مفتی محمد شفیع اور سید سلیمان ندوی کے حوالے سے یہ دیا ہے کہ شریعتِ اسلام میں صحیح یہی ہے کہ نماز کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ بھی فرض ہوئی ہے۔ جہاں تک معترض کے دوسرے سوال کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں تھانوی صاحب لکھتے ہیں۔

> "میں نے اپنے کالم میں وضاحت کر دی تھی کہ قرآنِ حکیم میں نصاب اور مقدارِ زکوٰۃ کے متعلق تصریح موجود نہیں اور نصاب مقدار اور مصارف کے احکام مدینہ منورہ میں نازل ہوئے تھے۔ گویا مصارف کے احکام تو وحیٔ متلو کے ذریعہ نازل ہوئے جو قرآن کا حصہ ہیں جبکہ نصاب اور مقدار کا نزول وحیٔ غیر متلو کے ذریعہ ہوا۔ یہ تو اسلام کا بنیادی اصول ہے کہ جب نبی دین کے بارے میں وہ احکام بتاتے ہیں جو قرآن میں نہیں ہوتے تو وہ بھی نزول من اللہ ہوتے ہیں۔"

تیسرا سوال بڑا اہم ہے اور جواب میں مولانا ارشاد الحق صاحب تھانوی نے جو کچھ تحریر کیا ہے اس کے چیدہ چیدہ اقتباسات پیشِ خدمت ہیں۔

(۱) "سورہ بقرہ کی ۲۱۹ آیت کریمہ منسوخ نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس کے بعد صرف فرض زکوٰۃ کی حد کا تعین کیا گیا۔ تاہم ربِّ کریم کے نزدیک اعلیٰ مقام اور انسانی فلاح کے لئے پسندیدہ فعل ضرورت سے زائد فی سبیل اللہ خرچ ہے۔ دراصل اسلام .... جس چیز کو لازمی قرار دیتا ہے اس پر وجدان کو بھی مطمئن کرنے کا اہتمام کرتا ہے۔ وہ قانونی

طور پر اتنا ہی لازم کرتا ہے جتنا سلامتیٔ معاشرہ کے لئے ناگزیر ہو اور لوگوں میں جو قوتِ متحمل عام طور پر پائی جاتی ہے۔ وہ اس کا بار آسانی سے اٹھا سکے..... اسلام کم سے کم پابندی کی لازمی حد اور بلند تر پسندیدہ حد کے درمیان کافی فاصلہ چھوڑ دیتا ہے تاکہ اس میں مختلف افراد اور مختلف نسلیں ہر زمانہ میں باہم مسابقت کرتی رہیں۔"

(۲) "نبی اکرمؐ کی تعلیم موسوی اور عیسوی دونوں شریعتوں کی جامع ہے۔ قانونی خیرات کی کم و بیش وہی مقدار باقی رکھی جو موسوی شریعت میں ملحوظ تھی۔ جب کہ اخلاقی خیرات جس کو ہر مسلمان کی مرضی اور خوشی پر منحصر رکھا ہے، اس کو حضرت عیسیٰؑ کے بلند روحانی تخیل کے مطابق قرار دیا۔"

اس کے بعد تھانوی صاحب زکوٰۃ کی حدود کو حضرت شبلی کے ایک فتویٰ کے ذریعہ واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

(۳) "حضرت شیخ اشرف الدین یحییٰ منیری نے اپنے مکتوبات میں حضرت شبلی کا یہ فتویٰ نقل کیا ہے۔ کسی نے حضرت شبلی سے استفتاءً پوچھا کہ زکوٰۃ کتنے پر ہوتی ہے۔ فرمایا۔ فقہاء کے مسلک پر جواب چاہتے ہو یا فقراء کے۔ کہا۔ دونوں کے۔ فرمایا فقہاء کے مسلک کے مطابق ایک سال گزرنے پر دو سو درم میں سے پانچ درم اور فقراء کے مسلک پر پورے کے پورے دو سو اور اس نذرانہ کی خوشی میں اپنی جان سر پر رکھ کر پیش کرنی چاہیئے۔ فقیہہ نے کہا ہم نے یہ مذہب ائمہ دین سے حاصل کیا ہے۔ فرمایا۔ ہم نے یہ مسلک صدیق اکبرؓ سے حاصل کیا ہے۔ جو کچھ تھا وہ سب سرورِ عالمؐ کے سامنے رکھ دیا۔"

"حضرت عثمان غنیؓ تاجر تھے اور ان کی تحویل میں بے شمار دولت تھی۔ مگر وہ لاکھوں اشرفیاں راہِ خدا میں خرچ کر دیا کرتے تھے اور اسی کی برکت تھی کہ پھر بھی ان کی دولت میں اضافہ ہوتا گیا..... میں نے اپنے آرٹیکل میں واضح طور پر یہ کہا تھا کہ دولت میں فی سبیل اللہ خرچ کرتے رہنے کے باوجود اضافہ ہوتا رہے یا بڑی رقم باقی رہے تو اللہ تعالیٰ ایسی دولت کو پاک کر دیتا ہے جس میں سے قانونی زکوٰۃ ادا کر دی جائے۔"

آج ہمارے معاشرے میں صورتِ حال یہ ہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں صرف قانونی زکوٰۃ کا مفہوم باقی رہ گیا ہے اور وہ اس لئے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ قانونی زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد ان پر مزید ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ خواہ ان کے پاس کروڑوں اربوں روپے ہوں اور خواہ ان کا معاشرہ معاشی بدحالی سے دوچار ہو۔ جب یہ بنیادی فلسفہ اور روح ختم کر دی گئی، تو قانونی زکوٰۃ کو ایک ٹیکس تصور کر لیا گیا۔"

قارئین کرام! تھانوی صاحب کے یہ اقتباسات تحریر کرنے اس لئے ضروری تھے کہ مجھے اپنی سوچ سمجھ کے مطابق اور قرآن کی روشنی میں انہی پر اظہارِ خیال کرنا ہے۔ اقتباس نمبر ۱ میں زکوٰۃ کے بیان سے پہلے ایک بات سامنے آئی ہے کہ قرآن کی کوئی آیت منسوخ بھی ہو سکتی ہے۔ ایسی آیت کا حکم بعض اوقات دوسری آیات سے منسوخ سمجھا

جاتا ہے اور بعض اوقات احادیث بھی قرآن کا حکم منسوخ کر دیتی ہیں۔ ناسخ و منسوخ کا یہ عقیدہ ان مذموم کوششوں میں سے ہے جو عجمی سازش کے تحت قرآن کی عظمت اور حقیقت کو دلوں سے دور کرنے کے لئے وجود میں لائی گئی تھی۔ اصل یہ ہے کہ قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں۔ ہمارے مروجہ مذہب میں اس سلسلہ میں سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۰۶ کا سہارا لیا جاتا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے۔ "یعنی جو آیت بھی ہم منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی (آیت) اور لے آتے ہیں۔ کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔ ۲/۱۰۶ آیت کا مفہوم کچھ اس طرح سے ہے کہ اس میں اہل کتاب کو مخاطب کیا جا رہا ہے۔ ان کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ جب خدا کی کتابیں پہلے سے موجود تھیں، تو پھر ایک نئی کتاب (قرآن) کی ضرورت کیوں پڑ گئی۔ نیز یہ بھی کہ اگر یہ کتاب خدا ہی کی طرف سے ہے تو اس میں ایسے احکام کیوں ہیں جو خدا کی پہلی وحی (تورات) کے خلاف ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان اہل کتاب سے کہلواتے ہیں کہ ان سے کہہ دو کہ ہماری طرف سے وحی کا انداز یہ ہے کہ کسی رسول کی وحی کے ایسے احکام جو وقتی طور پر نافذ العمل رہنے کے لئے دیئے گئے تھے انہیں بعد میں آنے والے رسول کی وحی کے احکام سے بدل دیا جاتا ہے اور یہ نئے احکام پہلے احکام سے بہتر ہوتے ہیں۔ جن سابقہ احکام کے متعلق اس کا فیصلہ ہوتا ہے کہ انہیں علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے یا جنہیں سابقہ رسولوں کی قومیں ترک یا فراموش کرتی ہیں یا ان میں اپنی طرف سے آمیزش کر دیتی ہیں (۲۲/۵۲) ان کی جگہ انہی جیسے احکامِ جدید وحی میں دے دیئے جاتے ہیں (۱۰۱/۱۰۶) اور یہ سب کچھ ہمارے اندازوں کے مطابق ہوتا ہے۔

انہی ہی اندازوں کے مطابق اب یہ آخری ضابطۂ حیات دیا گیا ہے جس میں تمام سابقہ سچائیاں آ گئی ہیں (۵/۴۸) جو ہر طرح سے مکمل ہیں (۶/۱۱۶) اور جو ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ اس لئے یہ ضابطہ اب تمام سابقہ ضوابط کی جگہ لے لیگا اور ہمیشہ نافذ العمل رہے گا۔ یاد رہے کہ اس سے پہلی آیت نمبر ۱۰۵ میں اہلِ کتاب اور مشرکین عرب کا ذکر ہے اور اس آیت (۲/۱۰۶) کے بعد کی آیت (۲/۱۰۷) میں بھی وہی لوگ مخاطب ہیں۔ اس سیاق و سباق میں آپ ہی بتائیں کہ قرآنی احکام کے منسوخ یا تبدیل کرنے کا سوال کیسے پیدا ہو گیا۔ ایسا سوچ تو کسی انسان کے بنائے ہوئے قانون کے ساتھ بھی نہیں کیا جاتا۔

مضمون کی ابتدا میں دوسرے سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا تھانوی صاحب نے متلو اور غیر متلو وحی کی دو اقسام کا ذکر کیا ہے۔ متلو جس کی تلاوت کی جائے یعنی قرآن اور غیر متلو جس کی تلاوت نہ کی جائے یعنی حدیث۔ وحی کی یہ اقسام مولانا صاحب کو کہاں سے ملیں یہ تو وہی بہتر جانتے ہیں۔ البتہ ان کا ذکر قرآن کریم میں کہیں نہیں۔ حتّٰی کہ حدیث کے اوّلین لٹریچر میں بھی اس اصطلاح کا کوئی پتہ نشان نہیں ملتا۔ دراصل یہ عقیدہ یہودیوں کا تھا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک شب کتب (جو لکھی جائے) اور دوسری شبعلفہ (جو لکھی نہ جائے) اور روایتاً آگے منتقل ہو۔

ہماری مذہبی پیشوائیت نے اس عقیدہ کو یہودیوں سے مستعار لیا اور اسے عین دین بنا کر پیش کر دیا۔ اس کے لئے ایک روایت وضع کی گئی کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ مجھ پر قرآن بھی نازل ہوتا ہے اور مثلُہٗ مَعَہٗ بھی۔ اس طرح ہمارا عقیدہ بن گیا کہ قرآن اور حدیث دونوں وحیٔ خداوندی ہیں اور دونوں میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں۔ لیکن یہ عقیدہ بھی خود ساختہ ہے اور قرآن سے اس کا کوئی سروکار نہیں۔ اللہ تعالیٰ حضورؐ سے کہلواتے ہیں۔

"اور میری طرف یہ قرآن اتارا گیا ہے کہ میں تم کو اس کے ذریعہ سے آگاہ کروں اور ان کو بھی جن تک یہ پہنچے۔" (۶/۱۹)

حضورؐ اور آپ کی امت کو اسی کتاب پر ایمان رکھنے کی ہدایت ہے۔

"اور کہہ دے کہ میں ایمان لایا اس کتاب (قرآن) پر جو اللہ نے اتاری۔" (۴۲/۱۵)

قرآن میں جہاں کہیں کتاب اتارنے کا ذکر آیا ہے اس سے مراد صرف قرآن ہے۔ سورۂ نساء میں فرمایا۔

"اے رسولؐ! تمہاری طرف یہ کتاب (ضابطۂ قوانین) نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے نزاعی امور کے فیصلے اس علم کے مطابق کرو جو اللہ نے تمہیں اس طرح عطا کیا ہے۔" (۴/۱۰۵)

سورۂ اعراف میں ہے کہ

"اے جماعتِ مومنین تم اس ضابطۂ قوانین (قرآن) کا اتباع کرو جسے تمہارے رب نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اور اس کے علاوہ کسی کارساز و رفیق کا اتباع مت کرو۔" (۷/۳)

اس میں خارج از قرآن سب کچھ آ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو 'حق' کے ساتھ نازل کیا ہے' لہٰذا الحق صرف قرآن ہی ہے۔ خدا نے یہ بھی فرمایا کہ "یہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کا شک نہیں۔" (۲/۲) اور "ظن حق کی جگہ کام نہیں دیتا۔" (۵۳/۲۸) اللہ تعالیٰ نے صرف قرآن کو ایمانی کتاب قرار دیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی امت کو اسی کتاب پر ایمان رکھنے کی ہدایت کی ہے۔

"اور کہہ دے کہ میں ایمان لایا اس کتاب پر جو اللہ نے اتاری۔" (۴۲/۱۵)

لہٰذا قرآن جس طرح ایمانی کتاب ہے دستور العمل بھی ہے اور اسی کی پیروی کا حکم ہے۔

"کہہ دے کہ میں تو بس اس کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کے پاس سے میری طرف وحی آتی ہے۔" (۶/۵۰)

سورۂ یونس میں اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ سے کہلواتے ہیں کہ "اگر تم کہتے ہو کہ یہ قرآن اس رسول کا خود ساختہ ہے تو تم اس قرآن نہ سہی صرف اس کی ایک سورت کی مانند بنا کر دکھاؤ۔ اس مقصد کے لئے تم خدا کو چھوڑ کر جس جس کو اپنی مدد کے لئے بلا سکتے ہو، بلا لو۔ اگر تم اس دعوے میں سچے ہو تو اس چیلنج کو قبول کرو۔" (۱۰/۳۸)۔

آپ قرآن کے اس چیلنج کو سامنے رکھیں اور ان لوگوں کی جسارت کی داد دیں جنہوں نے (ایک سورت تو درکنار) مثلہٗ معہٗ کے تحت سارے قرآن کی مثل بنا کر رکھ دی ہے۔

اپنے آرٹیکل کی ابتدائی سطور میں تھانوی صاحب فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کے مصارف، نصاب اور مقدار کے احکام مدینہ منورہ میں نازل ہوئے تھے۔ لیکن خود ہی فیصلہ کرتے ہیں کہ نصاب اور مقدار کا نزول وحیٔ غیر متلو (حدیث) کے ذریعہ ہوا۔ لیکن مصارفِ زکوٰۃ کے احکام وحیٔ متلو یعنی قرآن کے ذریعے نازل ہوئے۔ ذرا غور فرمائیں کہ مصارف، نصاب اور مقدار تینوں زکوٰۃ کے اجزاء ہیں لیکن خدا نے مصارفِ زکوٰۃ تو قرآن میں بیان کر دیئے۔ لیکن نصاب اور مقدار کے احکام وحیٔ غیر متلو (حدیث) کے لئے چھوڑ دیئے کہ چلو یہ ہمارا رسول بیان کر دے گا۔ تھانوی صاحب اگر قارئین کی تسلی کے لئے خدا کی اس مصلحت کو بھی بیان کر دیتے تو زکوٰۃ کے متعلق مزید ذہن صاف ہو جاتا۔ ایک بات انہوں نے تسلیم کی ہے کہ نصاب اور مقدارِ زکوٰۃ کے متعلق قرآن میں تصریح موجود نہیں۔ باقی رہے مصارفِ زکوٰۃ جن کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ وہ قرآن میں موجود ہیں (غالباً ان کا اشارہ سورہ توبہ کی آیت ۶۰ کی طرف ہے)' تو درحقیقت یہ زکوٰۃ کے نہیں صدقات کے مصارف ہیں۔ تھانوی صاحب کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ قرآن نے نہ زکوٰۃ کو صدقات کہا ہے اور نہ زکوٰۃ کے مصارف متعین کئے ہیں۔ زیرِ نظر آیت (۹/۶۰) میں صدقات کے متعلق منافقین کے ان الزامات کا جواب ہے جو انہوں نے سابقہ آیات میں صدقات کی تقسیم کے متعلق حضورؐ پر لگائے تھے۔

اپنے اسی اقتباس میں مولانا تھانوی صاحب نے اسلام کے ایک بنیادی اصول کی وضاحت کی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ "جب نبی دین کے بارے میں وہ احکام بتاتے ہیں جو قرآن میں نہیں ہوتے تو وہ بھی نزول من اللہ ہوتے ہیں۔" مولانا صاحب ایک جیّد عالمِ دین ہیں لیکن اسلام کا ایک بنیادی اصول بیان کرتے وقت کسی سند، حوالہ یا دلیل کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اس طرح ان کے اس قسم کے دعوے کی حیثیت یک طرفہ طور پر ایک فتوے کی رہ جاتی ہے۔ بہرحال وہ جس مروجہ مذہب کے نمائندہ ہیں وہ قرآن سے باہر بھی وحی کو تسلیم کرتا ہے جسے ہم حدیث کے نام سے پکارتے ہیں اور جس کے وجود سے کوئی مسلمان انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن یہاں سوال وجود کا نہیں مقام کا ہے۔ اسلام میں قرآن کا مقام سُپر اور اساسی حیثیت رکھتا ہے جس کے متعلق بے شمار قرآنی دلائل اسی مضمون میں آچکے ہیں اور جن کی رُو سے قرآن سے باہر کسی وحیٔ وجود ثابت نہیں ہوتا۔ قرآن اپنے وحی ہونے کی صداقت میں ایک دلیل یہ بھی پیش کرتا ہے کہ آپ اس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں پائیں گے۔ لیکن اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ کتبِ احادیث ان اختلافات سے بھری پڑی ہیں اور کسی ایک پر بھی متفق ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، تو ایسے میں حدیث کو کس طرح نزول من اللہ ہونے کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔ علامہ اقبالؒ جس نے صدرِ اوّل کا اسلام لانے کے لئے پاکستان کا تصور پیش کیا تھا' کے متعلق عرشی صاحب کا بیان ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ علامہ اقبالؒ سے پوچھا " خارج از قرآن ذخیرہ احادیث و روایات اور کتب فقہ کو شامل کر کے اس

مکمل ہوتا ہے یا قرآن اس باب میں کفایت کرتا ہے؟" انہوں نے فرمایا۔ "یہ چیزیں تاریخ و معاملات پر مشتمل ہیں انکی بھی ضرورت ہے اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ کن ضروریات کے تحت وضع کی گئیں۔ لیکن نفسِ اسلام قرآن میں بکمال و تمام آچکا ہے۔ خدا تعالیٰ کا منشا دریافت کرنے کے لئے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔" (البیان دسمبر ۱۹۲۹ء)

قرآن ابدی حقیقتوں اور مستقل اقدار کا مجموعہ ہے۔ خدا نے قیامت تک انسانوں سے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا اور قرآن کو محفوظ کر دیا۔ اس میں احکام بھی ہیں اور اصول بھی۔ جو حضور نبی اکرمؐ کو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی عطا ہوئے تھے۔ ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن دین کے ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقے بذریعہ وحی متعین نہیں ہوئے تھے۔ حضورؐ کو حکم خداوندی تھا کہ "ان کا تعین اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ سے کرو۔" (۳/۱۵۷)۔ اب ظاہر ہے کہ جو امور باہمی مشاورت سے طے ہوں وہ وحی نہیں ہوتے اور نہ وحی کی طرح ابدی اور غیر متبدل ہو سکتے ہیں۔ حضورؐ نے ان جزئیات کو صحابہ کرامؓ کے ساتھ مشورہ سے طے فرمایا۔ قرآن بتاتا ہے کہ دین کے بارے میں جو احکام قرآن میں نہیں ہوتے حضورؐ قرآن میں دیئے گئے مستقل اصولوں کی روشنی میں انہیں اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ سے طے کرتے تھے اور ایسے احکام نہ تو نزول من اللہ ہوتے تھے اور نہ غیر متبدل۔ حضورؐ کے بعد جماعتِ مومنین کے متعلق بھی کہا گیا کہ

"وہ یہ معاملات باہمی مشاورت سے طے کریں۔" (۴۲/۳۸)

لہٰذا اسلامی نظامِ مملکت میں باہمی مشاورت بھی ایک مستقل قدر ہے اور یہ مشاورت مستقل اقدار کی حدود کے اندر رہتے ہوئے جزئی معاملات طے کرنے کے لئے ہوگی۔

اب آیئے۔ یہ معلوم کریں کہ زکوٰۃ آخر کیا ہے؟ اس کے معنی ہیں نشوونما، بڑھنا، پھلنا پھولنا۔ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ کے معنی ہیں زکوٰۃ دو۔ اس زکوٰۃ دینے سے مراد کیا ہوگی۔ یہی کہ دوسروں کی نشوونما اور بالیدگی کا سامان بہم پہنچاؤ۔ قرآن کریم میں جو اس کا بار بار ذکر آیا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مومنین کا بنیادی فریضہ نوعِ انسانی کو نشوونما اور بالیدگی پہنچانا ہے۔ جس میں انسانی جسم کی پرورش، انسانی ذات کی بالیدگی اور ارتقاء وغیرہ سب آجاتا ہے۔ جماعتِ مومنین کی طرف سے ان کا یہ فریضہ نظامِ حکومت ادا کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں آیا ہے۔

"یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں تمکن حاصل ہوگا تو یہ نظامِ صلوٰۃ قائم کریں گے اور ایتائے زکوٰۃ کا انتظام کریں گے۔" (۲۲/۴۱)

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن نے ایتائے زکوٰۃ کو حکومتِ اسلامی کا فریضہ قرار دیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ زکوٰۃ خیرات کا نام نہیں۔ خیرات ہم انفرادی طور پر ہر حالت میں ہر جگہ دے سکتے ہیں۔ اس کے لئے اپنی حکومت کی شرط نہیں۔ ہم انگریزوں کی حکومت کے زمانے میں بھی خیرات دیتے تھے۔ اب ہندوستان کے مسلمان ہندوؤں کی حکومت میں بھی خیرات دے سکتے ہیں اور دیتے ہیں۔ لیکن ایتائے زکوٰۃ کے لئے اپنی حکومت کی شرط زکوٰۃ کی حقیقت واضح کر دیتی ہے۔ جب ایتائے زکوٰۃ

کی ذمہ داری اسلامی حکومت کی ٹھہری تو لامحالہ اس کے لئے ذرائع پیداوار بھی حکومت کی تحویل میں رہنے چاہئیں۔ افرادِ معاشرہ جس قدر کمائیں اپنی ضروریات سے زائد مملکت کو دے دیں تاکہ وہ ایتائے زکوٰۃ یعنی دوسروں کی نشوونما کے قابل ہو سکے۔ اس مقصد کے لئے قرآن کریم نے نہ کوئی شرح مقرر کی ہے نہ نصاب اور نہ اس کی ضرورت ہے۔

زکوٰۃ کے اس مفہوم اور پس منظر میں اب آپ سورہ البقرہ کی آیت نمبر ۲۱۹ اور زکوٰۃ کے متعلق سورہ توبہ کی آیت نمبر ۵ کا آپس میں موازنہ کریں تو پرویز صاحب کا اعتراض اور مولانا صاحب کی وضاحت دونوں بے معنی ہو جاتے ہیں۔ تھانوی صاحب زکوٰۃ کا جو مفہوم اپنے آرٹیکل میں لے رہے ہیں وہ خیرات کے زیادہ نزدیک ہے بلکہ خیرات ہی ہے اور اس صورت میں اپنی مملکت کی قطعاً ضرورت نہیں اور اگر اس کا موازنہ سورۃ الحج کی آیت نمبر ۴۱ سے کیا جائے تو مولانا تھانوی صاحب کے آرٹیکل کی ساری عمارت منہدم ہو جاتی ہے۔

جہاں تک اسلامی معیشت کے بنیادی فلسفہ کا تعلق ہے تو اس کی ہر شق نظامِ سرمایہ داری کی نفی کرتی ہے اور جس میں روپیہ پیسہ کے علاوہ جنس، خوراک اور دیگر سامانِ زیست کی ذخیرہ اندوزی شامل ہے۔ قرآن کے حوالہ سے چیدہ چیدہ اصول ملاحظہ فرمائیں۔

۱) مال و دولت کی تقسیم ایسی نہیں ہونی چاہیئے کہ یہ دولت مند طبقہ ہی میں گردش کرتی رہے اور محتاج و غریب اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم رہ جائیں۔ (۵۹/۷)

۲) تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی میں سے کس قدر دوسروں کی فلاح و بہبود کیلئے کھلا رکھیں۔ ان سے کہدو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہو سب کا سب۔" (۲/۲۱۹)

۳) اے رسولؐ! تم ان کے ان علماء و مشائخ کو اور ان کے ساتھ ان لوگوں کو جو سونے چاندی کے ڈھیر جمع کرتے رہتے ہیں اور نوعِ انسان کی بہبود کے لئے کھلا نہیں رکھتے الم انگیز عذاب کی خبر سنا دو۔" (۹/۳۴)

۴) صحیح معاشی نظام یہی ہے کہ جنہیں فاضلہ رزق حاصل ہو وہ اسے ان لوگوں کو دے دیں جنہیں اس کی ضرورت ہو تاکہ سامانِ زیست سے پرورش پانے میں سب برابر کے حصہ دار ہو جائیں۔ (۱۶/۷۱)

۵) کتنے ذی حیات ہیں جو اپنا رزق اپنی پیٹھ پر لادے لادے پھرتے ہیں یا اس کا ذخیرہ کرتے ہیں ان سب کو خدا کے کائناتی نظامِ ربوبیت کے مطابق سامانِ زیست ملتا ہے۔

۶) قارون (نظامِ سرمایہ داری کا نمائندہ) اپنی ہنرمندی اور چابکدستی کے باوجود (۲۸/۷۸) اپنے غلط نظام کی وجہ سے تباہ ہو گیا۔ کثرتِ دولت و قوت اس کے کسی کام نہ آئی۔

تدبّر کی فسوں کاری سے قائم رہ نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدّن کی بنا سرمایہ داری ہے

قارئین کرام! اقتصادی اور معاشی معاملات کے متعلق قرآنی اصول آپ نے ملاحظہ فرمائے اور جن سے ظاہر ہے کہ دولت کی تقسیم بنی نوع انسان میں ایک جیسی اور حسبِ ضرورت ہونی چاہیئے۔ سرمایہ کے جمع کرنے کی قطعاً گنجائش نہیں بلکہ اس کے لئے الم انگیز عذاب ہے جو ایسا کرتا ہے۔ سامانِ زیست پر پرورش پانے کا حق بنی نوع انسان کو ایک جیسا ہے۔ روئے زمین پر تمام جانداروں (انسان اور حیوان) کی پرورش کی ذمہ داری بھی نظامِ خداوندی پر ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ کو فکر لاحق ہوگئی کہ اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مرگیا، تو وہ خدائی احتساب سے نہیں بچ سکیں گے۔ آپ کسی پہلو سے بھی دیکھیں۔ دینِ اسلام میں سرمایہ داری اور غربت و افلاس کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن ابلیس کو یہ سب کچھ بھلا لگتا ہے۔ اسی بناء پر علامہ اقبالؒ نے اسی کی زبان سے کہلوا دیا۔

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا
میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

یہ سرمایہ داری نظام فریبِ نگاہ ہے جسے مذہبی تقدس کے خوشنما غلاف میں چھپایا جا رہا ہے اور اس کا نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات یعنی تمام صدقات و خیرات کے باوجود قوم میں محتاجوں اور ناداروں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے اور ان کے احساسِ افلاس کی شدت بھی بڑھ رہی ہے۔ مولانا تھانوی صاحب اپنے کالم کے آخر میں تسلیم کرتے ہیں کہ موجودہ زکوٰۃ سسٹم کے باوجود جہاں ایک طرف چند سرمایہ دار کروڑوں اور اربوں میں کھیل رہے ہیں، تو وہاں دوسری طرف سارا معاشرہ دن بدن معاشی بدحالی کا شکار ہو رہا ہے۔ اس کی ذمہ داری انہوں نے مروجہ زکوٰۃ سسٹم کی روح اور بنیادی فلسفہ کو نظر انداز کرنے پر ٹھہرائی ہے جو کہ درست نہیں ہے۔ دراصل مروجہ زکوٰۃ کا مفہوم ہی بتاتا ہے کہ یہ ایک ٹیکس ہے اور اس کے ذمہ دار عام لوگ نہیں بلکہ خود مذہبی پیشوا ہیں۔ کہتے ہیں کہ اگر کسی عمارت کی پہلی اینٹ ٹیڑھی ہو جائے تو وہ عمارت خواہ کتنی ہی فلک بوس ہو جائے ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہی رہے گی۔ ہم نے پانی کی ایک بھری ٹینکی میں مصلحتاً ایک سوراخ کر رکھا ہے اور لوگوں کو تاکید کر رہے ہیں کہ یہ ان کا مذہبی اور اخلاقی فریضہ ہے کہ پانی کی ٹینکی خالی نہ ہونے پائے۔ اپنی فرض زکوٰۃ کے مطابق ہم صرف اڑھائی فیصد خرچ کرتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ باقی لامحدود بچت (۲/۱ ۹۷) آپ اخلاقی اور اختیاری مد میں ڈال کر سرمایہ داری کا تدارک کر سکیں گے۔ ہرگز نہیں۔ یہ سوال حسابی نقطۂ نگاہ سے ہی غلط ہو جاتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم میں مال و دولت جمع کرنے کے خلاف اس قدر کثرت سے آیا ہے کہ اس کی موجودگی میں سرمایہ داری کا جواز ملنا مشکل کیا ناممکن ہو جاتا ہے۔ قرآنی نظام میں مال و دولت کو جمع کیا ہی نہیں جا سکتا۔ چونکہ سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت ایک ہی طاغوتی نظام کی شاخیں ہیں۔ اس لئے انہوں نے مصلحتاً باہمی گٹھ جوڑ سے اس کا حل یہ نکالا کہ جتنا جی چاہے مال و دولت جمع کرو مگر اس میں سے سال کے بعد تھوڑے سے پیسے (بالعموم اڑھائی فیصد) خدا کی راہ میں دے دو، تو باقی حلال و طیّب ہو جاتا ہے۔ خدا کا قانون ان تمام

مصلحتوں سے بالا ہے۔ جس نے سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۲۱۹ کے ذریعہ سرمایہ داری کے تمام دروازے بند کر دیئے اور کسی چھوٹے موٹے سوراخ کی بھی گنجائش نہیں رکھی۔ یہ آیت قرآن کی ایک مستقل قدر کی حیثیت رکھتی ہے جسے اس کے مقام سے نہیں ہٹایا جا سکتا۔ اس آیت میں خدا نے ایک غیر متبدل اور ابدی معاشی کلیہ بیان کیا ہے جس کا کوئی متبادل ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

تھانوی صاحب نے آیت مذکور کو منسوخ ہونے سے تو بچا لیا۔ البتہ فرض زکوٰۃ کے پردے میں ایک وضعی روایت کو اس کا متبادل ضرور بنا دیا۔ اس سے پہلے کہ مذکورہ روایت پیش کی جائے آپ سورۃ توبہ کی وہ آیت کریمہ سن لیجئے۔ جس کے ردِّ عمل کے طور پر اس کی ضرورت پیش آئی۔ ترجمہ

"جو لوگ سونا چاندی (مال و دولت) جمع کرتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے کھلا نہیں رکھتے۔ اے رسولؐ! تو انہیں الم انگیز عذاب کی "بشارت" سنا دے۔ (یہ عذاب اُس دن واقع ہوگا) جب سونے چاندی کے جمع کردہ ان سکوں کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا اور ان سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا اور پھر ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہ دولت ہے جسے تم نے اپنے مفاد کے لئے جمع کر رکھا تھا۔ سو اب اس جمع شدہ دولت کے لائے ہوئے عذاب کا مزہ چکھو۔" (۹/۳۴-۳۵)

بات کس قدر صاف اور ستھری ہوئی ہے۔ اب وہ روایت ملاحظہ فرمائیے جسے نظامِ سرمایہ داری کے جائز قرار دینے کے لئے وضع کیا گیا تھا:۔

"(حضرت) ابن عباس کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ (وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ) تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا۔ یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری اس فکر کو دور کر دوں گا۔ پس عمرؓ رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ یا نبیؐ اللہ! یہ آیت آپؐ کے اصحابؓ پر گراں گزری ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے ..... ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا بیان سنکر عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا ..... (ابوداؤد، بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ)

لیجئے جناب ایک وضعی روایت کی مدد سے اکتنازِ زرِ شیرِ مادر کی طرح حلال قرار پا گیا اور اس طرح نظامِ سرمایہ داری کے لئے تمام دروازے کھل گئے۔ قرآنی آیت کے الفاظ اپنی جگہ برقرار اور محفوظ رہے اور وضعی روایت سے وہ سب جائز قرار پا گیا جسے قرآن نے اس آیت کے ذریعہ حرام قرار دیا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے شاید اسی صورتِ حالات پر یہ کہنے کی ضرورت

محسوس کی کہ

احکام تیرے سچ ہیں مگر اپنے مفسّر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

مذکورہ روایت کے الفاظ کو ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ یعنی خدا کا حکم، رسولؐ اللہ کی زبان مبارک اور صحابہ اکرامؓ پر گراں گزرے معاذ اللہ۔ اور پھر جب ایک حرام چیز (جمع کردہ دولت) حلال قرار پا گئی تو حضرت عمرؓ جیسے شاہکارِ رسالتؐ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا۔ استغفر اللہ۔ قرآن کہتا ہے کہ حضورؐ خود وحی کا اتباع کرتے تھے (۱۰/۱۰۹)۔ لہٰذا ان کا کوئی قول و فعل خلافِ قرآن نہیں ہو سکتا۔ مندرجہ بالا روایت کو اگر اس کسوٹی پر پرکھا جائے تو پورا نہیں اترتی، لہٰذا صحیح نہیں ہے۔

جہاں تک مولانا تھانوی صاحب کے اقتباس نمبر ۲ کے جواب کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں گذارش ہے کہ آج ہمارے سامنے قرآنِ کریم کے علاوہ کوئی اور آسمانی کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں۔ ہم پورے وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ موسوی اور عیسوی شریعتوں میں کیا لکھا تھا۔ لہٰذا حضورؐ کی تعلیم کو موسوی اور عیسوی شریعتوں کا جامع قرار دینا مطلب سلوم نہیں ہوتا۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ تمام رسول اور کتب برحق ہیں اور ہم سابقہ پیغمبروں میں کسی تفریق کے قائل نہیں۔ البتہ یہ جو کہا گیا ہے کہ بعض کو بعض پر فوقیت دی گئی تو اس کا مطلب دائرۂ کار سے ہے۔ ہمارے پیغمبرؐ اسلام تمام عالمِ انسانیت کے لئے مبعوث ہوئے تھے جب کہ ان سے پہلے خدا کے رسول کسی خاص ملک یا قوم کی طرف آتے رہے۔ بہرحال جب اسلام آیا تو اس نے اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کو بھی اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی اور انہیں بتایا گیا کہ یہ وہی دین ہے جو تمام انبیاءؑ کو شروع سے دیا جاتا رہا۔ لیکن اہلِ کتاب کے ہاں بہت سی باتیں ہیں جنہیں اسلام (قرآن کے اندر) غلط قرار دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے دین میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور اسے اس کے صحیح مقام پر نہیں رہنے دیا۔ اللہ نے انہیں حضورؐ سے کہلوایا کہ تم اس باب میں حقیقت سے تجاوز نہ کرو اور اللہ کی طرف حق بات کے علاوہ اور کوئی بات منسوب نہ کرو (۴/۱۷۱)۔ ان حالات میں جب کہ اسلام ایک مکمل دین ہے ہمیں موسوی اور عیسوی شریعتوں سے کچھ مستعار لینے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ البتہ مولانا تھانوی صاحب کی ایسی باتیں پڑھ کر ذہن ہندوستان کے نیشنلسٹ علماء کی طرف ضرور منتقل ہوتا ہے جنہوں نے برصغیر کی تقسیم سے پہلے ہندوؤں کی ہمنوائی میں الاسلام کی بجائے برہمو سماجی اسلام تحریک چلائی تھی۔ جس کی تعلیم کے مطابق یہ مسلک قرار پایا کہ ہر مذہب میں سچائی ہے۔ لہٰذا تمام مذاہب ایک مشترکہ اور متفقہ حقائق پر جمع ہو جائیں۔ اصل دین خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی ہے جو عام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے اور اس لحاظ سے اسلام کو دوسرے مذاہبِ عالم پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ لیکن افسوس کہ وہ قرآن کے اس دعویٰ کو بھول گئے جس کے مطابق وہ

تمام سچائیاں جو وقتاً فوقتاً دوسرے انبیاء کرامؑ پر نازل ہوتی رہیں اب صرف قرآنِ کریم کے اندر ہیں کہیں اور نہیں۔ اور وہ قرآن کا یہ ارشاد بھی فراموش کر گئے کہ

"جب یہ لوگ اس طرح ایمان لائیں جس طرح اے جماعتِ مؤمنین تم لائے ہو تو پھر انہیں صحیح راستہ پر سمجھا جائے گا۔" (۲/۱۳۷)

پس اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہدایت پانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ حضور نبی اکرمؐ اور آپ پر نازل کردہ (قرآنِ کریم) پر ایمان لایا جائے اور اسی کے مطابق اعمالِ صالحہ کیے جائیں۔ اس کی وضاحت ربّ العالمین نے یہ کہہ کر کر دی کہ "وہ ایمان لائے اس پر جو محمدؐ پر نازل کیا گیا اور جو اُن کے ربّ کی طرف سے حقیقتِ ثابتہ ہے۔" (۲/۴۷)

ایک اور عجیب بات جو فاضل مضمون نگار حضرت عثمان غنیؓ کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ لاکھوں راہِ خدا میں خرچ کر دیا کرتے تھے۔ پھر بھی ان کی دولت میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور بقول تھانوی صاحب اس اضافی اور فاضلہ دولت کو وہ قانونی زکوٰۃ کے ذریعہ پاک کر لیا کرتے تھے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر قرآنی حکم قُلِ الْعَفْوَ پر عمل ہو تو فاضلہ دولت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے اگر مولانا صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ قرآنی حکم کو محض اخلاقی اور اختیاری حیثیت دے کر عمل رواجی حکم پر کرتے تھے تو یہ ناقابلِ تسلیم ہے۔ حضرت عثمان غنیؓ کی دولت اور امارت کے متعلق یہ سب باتیں اسلام لانے سے قبل تک تو ٹھیک ہیں۔ لیکن اسلام لانے کے بعد جب انہوں نے دین کا رنگ اپنا لیا تو پھر ان کا سب کچھ نظامِ خداوندی کے تحت خدا اور رسول کا ہو گیا۔ یہاں ایک اہم نکتہ قابلِ غور ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ نظامِ سرمایہ داری جسے ختم کرنے کے لیے دینِ اسلام آیا تھا مروجہ مذہب میں عین مطابق اسلام پا گیا۔ اس سلسلہ میں مذہبی پیشوائیت کامیاب بھی ہو گئی۔ لیکن قرآنی اصولوں کے برعکس اسے سرمایہ داری کے جواز میں کافی دقتیں اور مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ فرض اور قانون کی حیثیت تو انہوں نے ایک وضع کردہ روایت کو دے دی۔ اب انہیں کوئی نامعلوم احساس چین نہیں لینے دیتا۔ کبھی تو قرآن کی مذکورہ آیت کے تحت ضرورت سے زائد خرچ کو پسندیدہ فعل (لیکن اختیاری) کا مقام دیا جاتا ہے۔ کبھی وجدان کے پردے میں اخلاقی خیرات قرار دے کر اس کے ڈانڈے حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کے روحانی تخیل سے جا ملاتے ہیں اور کبھی اسے حضرت شبلی کے فتوے کے مطابق تصوف کا رنگ دے دیتے ہیں۔

دین ایک ناقابلِ تقسیم اکائی ہے جو ایک ہی صراطِ مستقیم کی ترجمان ہے۔ ہم اسے فقہاء اور فقراء کی خود ساختہ تقسیم کے ذریعہ افراط و تفریط کے حوالے نہیں کر سکتے۔ اسلام ایسے مثالی معاشرے کا تصور دیتا ہے جس کے افراد میں اقتصادی، اخلاقی معاشرتی اور معاشی حدود میں کوئی فاصلہ نہیں ہوتا۔ ایسے معاشرے میں اجتماعی خوشحالی اور انسانی ذات کی نشوونما کا انتظام یکساں طور پر قوانینِ خداوندی کے تحت اسلامی مملکت کرتی ہے۔ یقین رکھیں وہاں مختلف احکام کے تحت لازمی اور پسندیدہ حدود کے خیالی فاصلوں کا کوئی تصور نہیں۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو ہم برائے نام معمولی شرح کے ساتھ اپنی

خود ساختہ قانونی زکوٰۃ کے ذریعہ کروڑوں اور اربوں روپے کی دولت کے اکتناز کا سامان پیدا کرتے ہیں اور دوسری طرف معاشرہ کی بدحالی کا رونا بھی روتے ہیں۔ یہ طریقہ کار سنتِ رسولؐ کے مطابق نہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ حضورؐ پہلے خود وحی کا اتباع کرتے تھے پھر دوسروں سے اس کا اتباع کراتے تھے۔ ان کا کوئی قول و فعل خلافِ قرآن نہیں ہو سکتا۔ زندگی کے کسی شعبہ میں جب ہم قرآن کے کسی حکم کی تعمیل کرتے ہیں تو دراصل حضورؐ کی سنت پر ہی عمل کر رہے ہوتے ہیں اور یوں ہمارا طریقہ قرآن و سنت کے مطابق ہو جاتا ہے۔ سورہ البقرہ کی آیت ۲۱۹ کو ہی لے لیں۔ حضورؐ نے اس کے مطابق ایک پائی بھی ضرورت سے زائد اپنے پاس نہیں رکھی۔ کوئی جائداد کھڑی نہیں کی۔ دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنے ورثہ میں کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ اور یہ اس زمانے کی بات ہے جب ایک وسیع مملکت وجود میں آچکی تھی اور حضورؐ اس مملکت کے سربراہ تھے۔ فرمانِ نبویؐ ہے کہ انبیاء کی جماعت کسی کو اپنا وارث نہیں چھوڑا کرتی۔ ان کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ ربوبیتِ عامہ کے لئے وقف ہوتا ہے۔ حضورؐ نے ساری عمر نہ نصاب کے مطابق جمع ہونے دیا اور نہ زکوٰۃ دی۔ یہ ہے وہ مثالی نظام اور حضورؐ کی حیاتِ طیبہ جو امت ہی کے لئے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لئے (اسوۂ حسنہ) بہترین نمونہ ہے۔

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بُتان وہم و گماں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ

محترمہ بلند اختر صاحبہ کراچی

مملکتِ پاکستان کے برسرِ اقتدار لوگو!

آپ سب مسلمان ہونے کے مدعی ہیں۔ آپ سب کا ایمان ہے یا ہونا چاہیئے کہ قرآن پاک نوعِ انسانی کی رہنمائی کے لئے آیا ہے۔ جو اس رب کی کتاب ہے جس نے ہر ذی حیات کی ربوبیت کا ذمہ لے رکھا ہے۔ جو اس پوری کائنات کو اس حسن و خوبی سے چلا رہا ہے کہ عقل حیراں ہے۔ جس کے قوانین ایسے محکم ہیں کہ ازل سے نتائج اس کے قانون کے مطابق نکل رہے ہیں اور ابد تک نکلتے رہیں گے۔ نتائج کو اس کے قانون کے مطابق نکلنے سے نہ کبھی کوئی روک سکا ہے نہ روک سکے گا۔

تو مملکتِ پاکستان کے سربراہو! خدا کے لئے سوچو کہ قرآن پاک نے ملک کا سربراہ مقرر کرنے کے لئے کیا طریقہ تجویز کیا ہے۔ خود کو خدا سے زیادہ عقل مند سمجھنا چھوڑ دو۔ اس کی رہنمائی پر یقینِ کامل رکھ کر چلو تمہاری سب الجھنیں دور ہو جائیں گی۔ صحیح راہ روزِ روشن کی طرح ابھر نکھر کر آپ کے سامنے آجائے گی اور اگر آپ عزم و استقلال سے اس راہ پر یقینِ کامل سے چلتے رہے، تو نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ آپ نے صحیح قدم اٹھایا ہے۔

اتحاد بین المسلمین ہی نہیں، اتحاد بین نوعِ انسان وقت کی اشد ترین ضرورت ہے۔ اگر ایک خدائے واحد کی رہنمائی میسر ہو، تو عین ممکن ہے۔ پھر یہی کرۂ ارض جو آج جہنم بنا ہوا ہے جنت بن جائے گا۔

سوچیئے۔ غور کیجئے کہ اب تو مہلت کا وقت بھی ختم ہوا جا رہا ہے۔ رہنمائی آپ کے پاس ہے، محفوظ بھی ہے اور مکمل بھی۔ اختیار اور ارادہ بھی ہے اور وقت بھی۔ صحیح جانب قدم اٹھایئے۔ لا کی منزل سے گزر جایئے۔ ہر باطل کو مسترد کر دیجئے۔ کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔ اس وقت ساری دنیا بھٹکی ہوئی ہے۔ خدا کی رہنمائی جو قرآن پاک میں محفوظ ہے ساری دنیا کو فلاح کی راہ دکھا سکتی ہے۔ سوچیئے۔ سوچیئے۔ مل کر سوچیئے۔ اپنی ذات سے بالاتر ہو کر اللہ کے دیئے ہوئے پروگرام پر چل پڑنے کا فیصلہ کر لیجئے۔ ورنہ تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں کہ یہی خدا کا قانون ہے۔

کاروانِ زندگی بے منزل است

یہ ہماری انتہائی بدقسمتی ہے کہ قوم میں کوئی لیڈر بھی ایسا نظر نہیں آتا کہ جو ذاتی یا گروہ مندانہ مفاد سے بلند ہو کر، ملک وملت کے مفاد و مصالح کو اپنے سامنے رکھے ہوئے ہو۔ اس وقت نہ قوم کے نام پر چیخ و پکار کرنے والوں کے دل میں قوم کا کوئی درد ہے نہ اسلام کے نام پر خدا اور رسولؐ کا واسطہ دینے والوں کے سینے میں احیائے اسلام کی کوئی تڑپ۔ یہ لوگ بلند آہنگ نعروں سے آپ کے جذبات کو مشتعل کرتے رہتے ہیں اور اس طرح ذاتی اہمیت حاصل کر کے اپنی قیمت بڑھاتے چلے جاتے ہیں اور جب سودا بازی کا وقت آتا ہے تو آپ سے پوچھتے تک نہیں۔ ہم ابھی HORSE TRADING کی اصطلاح سے بھی پوری طرح آشنا نہ ہو پائے تھے کہ ہماری سیاست نے لوٹا، لفافہ اور "بریف کیس" جیسی اصطلاحات وضع کر ڈالیں۔ خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے۔

یاد رکھئے۔ پروپیگنڈہ اس دور کا سب سے زیادہ خطرناک حربہ ہے اور جن پارٹیوں کے پاس کہیں سے فنڈز آجاتے ہیں وہ اس حربہ کو سب سے زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ پراپیگنڈہ انسان کے سمجھنے، سوچنے اور فیصلہ کرنے کی قوت کو مفلوج کر دیتا ہے۔ اس حربہ کو ناکام بنا دینے کا طریق یہ ہے کہ آپ نہ ایک فریق کے پراپیگنڈہ پر کان دھریں نہ دوسرے فریق کی سنیں۔ خاموشی سے اپنے کام میں لگے رہیں اور انتخابات کا انتظار کریں اور جب ایسا وقت آئے تو ایسے امیدواروں کا انتخاب کریں جو ڈیموکریسی DEMOCRACY کی جگہ QURANOCRACY میں یقین رکھتے ہوں کہ اسی میں قوم کی بہتری ہے اور اسی میں مملکت کی بہبود۔

عاطف طفیل
ایم ایس سی (فزکس)

آزادی سے فرار

نوٹ: یہ مضمون صرف وجودی آزادی سے متعلق ہے۔ سیاسی اور معاشی آزادی اس کا موضوع نہیں ہے

ایرک فرام کا کہنا ہے کہ ذرا غور سے دیکھا جائے تو انسان اپنے پیدا ہونے سے پہلے اپنی ماں کے وجود کے ساتھ ایک اکائی کی صورت میں پل رہا ہوتا ہے اور اس کا وجود اپنی ماں کے وجود کے ساتھ ہم آہنگ رہتا ہے۔ جب وہ پیدا ہوتا ہے تو ماں کے ساتھ اپنے اس ربط اور ہم آہنگی کو توڑ دیتا ہے جو فطری قوانین کے تحت اس نے قائم کر رکھی تھی۔ مطلب یہ کہ ماں کے پیٹ میں انسان کو شعوری طور پر عمل کرنے کا اختیار نہیں ہوتا اس لئے رحمِ مادر میں وہ ایک طرح سے فرشتوں کی سی زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے لیکن جب ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے اور ماں کے وجود کے ساتھ اس کا ایکا (ONENESS) اور ہم آہنگی ختم ہو جاتی ہے تو بھی کچھ عرصے تک وہ ماں کا محتاج رہتا ہے اور پہلے کی طرح اپنے آپ کو ماں ہی کے وجود کا جز سمجھتا ہے۔ ماں اسے سامانِ نشوونما فراہم کرتی ہے اور یوں اس کی پرورش کے مختلف مراحل طے ہونے لگتے ہیں۔ پرورش کے اس سفر میں ایک خاص مرحلے پر اس کے اندر اپنے جداگانہ وجود کا احساس انگڑائی لیتا ہے۔ یہاں اس کے اندر "میں" نمودار ہونا شروع ہوتی ہے۔ وہ اپنے اور دوسروں کے وجود میں امتیاز کرنا سیکھتا ہے۔ اور گرد و پیش کے ماحول سے اپنے آپ کو متمیز اور منفرد سمجھنے لگتا ہے۔ انسانی بچے کی اس نئی وجودی حالت کو ہم فلسفیانہ رنگ دیتے ہوئے شاہد و مشہود کی تقسیم سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ سارا عمل جدلیاتی ہوتا ہے۔ اپنے علیحدہ اور منفرد وجود کا احساس اس کے لئے نہایت خوشگوار ہوتا ہے اور وہ خود مختاری اور آزادی کے اس نوخیز احساس سے سرشار ہو جاتا ہے۔ من و تو کی یہ تقسیم جہاں اپنے جلو میں اختیار و ارادہ کی نوید لاتی ہے وہاں تنہائی، بے بسی اور عدم تحفظ جیسے احساسات ابھارنے کا سبب بھی بنتی ہے۔ ماں کے بطن میں انسان بلاشبہ یقینی اور طے شدہ صورت حال میں دن گذار رہا ہوتا ہے لیکن ماں کے بطن سے الگ ہوتے ہی وہ اپنے آپ کو ایک غیر یقینی، غیر محدود اور غیر متعین صورتحال میں گھرا ہوا پاتا ہے۔ اب اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی اس آزادی کے خطرات سے بچنے کا سامان پیدا کرے۔ سب سے پہلے تنہائی کے روگ کو ختم کرنے کے لئے وہ اپنے آس پاس کے لوگوں کے ساتھ رشتے ناطے

نے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اس کی اس ضرورت کو ہم وجودی ضرورت سے موسوم کریں گے۔

اس "وجودی ضرورت" یعنی انفرادیت سے پیدا ہونے والی تنہائی کو دُور کرنے کے لئے وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ رشتے ناطے جوڑنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ رشتے ناطے جوڑنے یا اپنے ہم جنسوں کی سنگت (RELATEDNESS) حاصل کرنے کے سبھی طریقے نہ صرف اس کی آزادی و خود مختاری کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ بلکہ انفرادیت سے پیدا ہونے والی اس کی اجنبیت اور تنہائی میں مزید اضافے کا موجب بن جاتے ہیں اور اس طرح آزادی و خود مختاری کی رحمت اس کے لئے زحمت بن جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پروردگار نے یہاں بھی اسے راہنمائی سے محروم نہیں رکھا۔ تاہم اس راہنمائی کی نشاندہی سے پہلے ضروری ہوگا کہ ان راستوں کا ادراک حاصل کر لیا جائے جو انسان اپنے طور پر اختیار کرتا چلا آرہا ہے۔ وہ ہیں:

ایذا کوشی (SADISM)

اس قاعدے کے مطابق انسان اپنی سنگت کی وجودی ضرورت کی تسکین دوسرے کو اذیت دے کر کرتا ہے۔ وہ دوسروں کو گزند پہنچا کر ان سے ربط قائم کرتا ہے۔ مسلم ملوکیت کی سیاہ تاریخ ایذا کوشی کی روح فرسا مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ جابر سلاطین اور مستبد بادشاہ اپنی ایذا کوشی کے انسانیت کش جذبے کی تسکین کے لئے مفلوک الحال قیدیوں کو بھوکے شیروں کے حوالے کر دیتے اور پھر جب شیر اُن مظلوم قیدیوں کے اجسام کی چیر پھاڑ کرتا تھا تو وہ لطف اندوز ہوتے تھے۔ ایذا کوشی کی ماہیت کو سمجھنے کے لئے ہم وہ معاہدۂ نکاح سامنے لاتے ہیں جو ونڈا نے اپنے شوہر ساخر میزوخ سے کیا تھا۔ یہ معاہدہ تاریخ کے دفتین میں محفوظ ہے۔

"میرے غلام! وہ شرائط جن کی بنا پر میں تمہیں بطور ایک غلام کے قبول کرتی ہوں درج ذیل ہیں۔

تم اپنے آپ کو کامل طور پر میرے سپرد کرتے ہو۔ تمہاری اپنی کوئی مرضی نہیں ہے، میری مرضی ہی تمہاری مرضی ہوگی۔ تم میرے ہاتھوں میں ایک بے جان آلۂ کار ہو اور میرے تمام احکام کی بے چون و چرا تعمیل کرو گے۔ اگر تم بھول جاؤ کہ تم میرے غلام ہو اور میری کامل اطاعت میں کوتاہی کرو گے تو میں تمہیں سزا دینے کی مجاز ہوں گی اور جیسے چاہوں گی سزا دوں گی۔ میں تمہیں کوئی خط یا مسرت بخشوں تو یہ میرا کرم ہوگا اور تمہیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ میرا احسان ہے۔ مجھ پر تمہارا اس قسم کا کوئی حق نہ ہوگا۔ میں تم پر سخت ترین تشدد کرنے کی مجاز ہوں جو تمہیں بغیر شکایت کے برداشت کرنا ہوگا۔ اگر میرے پاس دولت ہو اور اس

کے باوجود تمہیں بھوکا رکھوں اور تمہیں پاؤں تلے کچل دوں تو بھی تمہیں بغیر کسی پس و پیش کے میرے پیروں کو چومنا ہوگا۔ میں تمہیں کسی وقت بھی کمرے سے باہر نکال سکتی ہوں لیکن تمہیں میری رضامندی کے بغیر باہر جانے کی اجازت نہ ہوگی اور تم نے بھاگ نکلنے کی کوشش کی تو مجھے اس بات کا اختیار ہوگا کہ تمہیں ہر طریقے سے عذاب دے کر جان سے مار دوں۔ میرے سوا تمہارا کچھ بھی نہیں ہے۔ میں ہی تمہاری سب کچھ ہوں، زندگی ہوں، تمہارا مستقبل ہوں، تمہاری خوشی ہوں، تمہاری شامت ہوں، تمہاری مسرت ہوں، تمہارا غم ہوں، تمہیں میرے احکام کی تعمیل کرنا ہوگی۔ اس کا نتیجہ اچھا نکلے یا برا۔ اگر میں تمہیں کہوں کہ کسی جرم کا ارتکاب کرو تو تمہیں میری خوشنودی کے لئے جرم کرنا ہوگا۔ تمہاری عزت میری ملک ہے۔ تمہارا خون، تمہاری روح، تمہاری توانائی سب کچھ میرا ہی ہے۔ میں تمہاری زندگی اور موت پر پوری طرح متصرف ہوں۔ اگر تمہیں کبھی اس امر کا احساس ہو کہ تم میری حکومت کو برداشت نہیں کر سکتے اور یہ زنجیریں تمہارے لئے بہت بوجھل ہو گئی ہیں تب تمہیں خودکشی کرنے کا اختیار ہوگا۔ میں تمہیں کبھی بھی رہا نہیں کروں گی۔"

دستخط وانڈا فان دوناجیو

اس معاہدے پر دستخط کرتے ہوئے ساحر میزوخ نے لکھا۔

"میں اپنی عزت و وقار کے نام پر عہد کرتا ہوں کہ میں مادام وانڈا فان دوناجیو کا غلام ہوں بالکل اس مفہوم میں جو کہ مندرجہ بالا سطور سے عبارت ہے اور میں برضا و رغبت اس کی ہر خواہش کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں۔"

دستخط ڈاکٹر لیوپولڈ بیرن فان ساخر میزوخ

اس معاہدۂ نکاح کے مطالعے سے ایذاکوشی کی بنیاد پر قائم کردہ تعلقات کی تفہیم شرح صدر سے کی جاسکتی ہے۔

ایذا طلبی (MASOCHISM)

اس رجحان یا قاعدے کے مطابق، انسان دوسرے سے رشتے ناطے اس طرح جوڑتا کہ اس کی اپنی عزت مجروح ہو۔ وہ اپنی تذلیل سے حظ اٹھاتا ہے۔ جنسی نفسیات کی اصطلاح میں ایذا طلب اس شخص کو کہتے ہیں جو اذیت اٹھا کر نفسانی حظ و مسرت محسوس کرے۔

مولانا اشرف علی تھانوی اپنی شہرہ آفاق تصنیف "بہشتی زیور" میں خواتین کو ایذا طلبی کی تعلیم دیتے

تے ہیں کہ

"عورت کو شوہر کے تمام احکامات بلا چون وچرا بجالانا چاہئیں۔ یہاں تک کہ اگر وہ کہے کہ ایک پہاڑ سے پتھر اٹھا کر دوسرے پہاڑ تک لے جاؤ اور پھر دوسرے سے تیسرے تک، تو اسے یہی کرنا چاہیئے۔ اگر شوہر بیوی کو اپنے کسی کام سے بلائے اور وہ چولہے پر بیٹھی ہو تو تب بھی اس کے کام کے لئے فوراً اٹھ جانا چاہیئے۔ یہاں تک کہ مرد کی فرمانبرداری ضروری ہے کہ اگر اس کی مرضی نہ ہو تو نفل روزے نہ رکھے اور نفل نماز نہ پڑھے، عورت کے لئے ضروری ہے کہ مرد کو خوش رکھنے کے لئے بناؤ سنگھار کے ساتھ رہا کرے۔ اگر مرد کے کہنے کے باوجود بناؤ سنگھار نہ کرے تو مرد کو مارنے کا اختیار ہے۔ اس کو چاہیئے کہ اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر کہیں نہ جائے، رشتہ داروں کے یہاں اور نہ غیروں کے ہاں۔"

ولانا بیوی کا مقصدِ حیات شوہر کی خوشی قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے عورت کے لئے مکمل ہدایات پیش کی یں۔ مثلاً شوہر کا دل ہاتھ میں لئے رہو، اس کی آنکھ کے اشارے پر چلو، اگر وہ حکم کرے کہ ساری رات ہاتھ باندھے کھڑی ادر اس کے حکم کی تعمیل کرے۔ کیونکہ اس میں عورت کی بھلائی ہے۔ اگر وہ دن کو رات بتائے تو عورت بھی دن کو رات کہنے لگے۔ شوہر کو کبھی بھی برا بھلا نہیں کہنا چاہیئے کیونکہ اس سے دنیا اور آخرت دونوں خراب ہوتی ہیں۔ شوہر سے بھی زائد خرچ نہیں مانگنا چاہیئے اور نہ ہی اس سے کوئی فرمائش کرنی چاہیئے۔ اگر عورت کی کوئی خواہش پوری نہ ہو تو خاموش رہنا چاہیئے اور اس بارے میں کسی سے ایک لفظ بھی نہ کہے۔ کبھی کسی بات پر ضد نہیں کرنی چاہیئے۔ اگر شوہر سے کوئی تکلیف بھی ہو تو اس پر خوشی ظاہر کرنی چاہیئے۔ اگر شوہر کبھی کوئی چیز لادے، چاہے وہ اسے پسند آئے یا نہ ئے لیکن اس پر خوشی کا اظہار کرنا چاہیئے، اگر شوہر کو غصہ آجائے، تو ایسی بات نہیں کرنا چاہیئے کہ اور غصہ آئے۔ اس کے مزاج کو دیکھ کر بات کرنی چاہیئے۔ اگر وہ ہنسی دل لگی چاہتا ہے تو اسے خوش کرنے کی باتیں کرو۔ اگر ناراض ہو تو عذر و معذرت کر کے، ہاتھ جوڑ کر اسے راضی کرو۔ شوہر کو کبھی اپنے برابر کا مت سمجھو اور اس سے کسی قسم کی خدمت مت اگر وہ کبھی سر دبانے لگے تو اسے ایسا مت کرنے دو۔ اٹھتے بیٹھتے، بات چیت، غرض کہ ہر بات میں ادب اور تمیز کا ل رکھنا انتہائی ضروری ہے۔

اگر شوہر پردیس سے آئے تو اس کا مزاج پوچھنا چاہیئے، اس کے ہاتھ پاؤں دبانا چاہئیں اور فوراً اس کے لئے ے کا انتظام کرنا چاہیئے۔ اگر گرمی کا موسم ہو تو پنکھا لے کر اس پر جھلنا چاہیئے اور اسے آرام پہنچانا عورت کے ں میں سے ہے۔

گھر کے معاملات میں مولانا ہدایت دیتے ہیں کہ بیوی کو یہ حق نہیں ہے کہ میاں سے تنخواہ کا حساب کتاب پوچھے

اور کہے کہ تنخواہ تو بہت ہے، اتنی کیوں لاتے ہو یا کہاں خرچ کر ڈالا اور کس چیز میں اتنا پیسہ اٹھایا وغیرہ۔ اسی طرح شوہر کی ہر چیز سلیقہ سے رکھو، رہنے کا کمرہ، بستر، تکیہ اور دوسری چیزیں صاف ستھری ہونی چاہئیں۔ اگر شوہر کسی دوسری عورت سے ملتا ہے تو اسے تنہائی میں سمجھاؤ۔ پھر بھی باز نہ آئے تو صبر کر کے بیٹھ جاؤ۔ لوگوں کے سامنے اس کا ذکر کر کے اسے رسوا مت کرو۔ اس ضمن میں مولانا کہتے ہیں کہ مردوں کو خدا نے شیر بنایا ہے۔ دباؤ اور زبردستی سے ہرگز زیر نہیں ہو سکتے ان کے زیر کرنے کی بہت آسان ترکیب خوشامد اور تابعداری ہے۔

اس طرح مولانا اشرف علی تھانوی نصف سے زیادہ آبادی (مخلوق) کو ایذا طلب نفسیاتی مریض بننے کی تعلیم دیتے ہیں۔ ایذا طلبی کی بنیاد پہ جو انسانی تعلقات قائم ہوتے ہیں اور جس طرح انسانی اختیار و ارادہ کی مٹی پلید ہوتی ہے اس کی تفہیم کے لئے بہشتی زیور کا مطالعہ ہی مفید رہے گا۔

خودکار مطابقت پذیری (AUTOMATON CONFORMITY)

اس رجحان کے زیرِ اثر انسان اپنے ماحول اور گرد و پیش کے انسانوں سے اپنی ذات (SELF) کی نفی کر کے تعلق قائم کرتا ہے۔ وہ ہجوم میں گم ہو کر اپنا علیٰحدہ تشخص کھو بیٹھتا ہے۔ وہ منڈی کی کمرشل اقدار کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالتا ہے اور یوں آزادئ اختیار و ارادہ سے محروم ہو کر روبوٹ بن جاتا ہے۔ وہ بزعمِ خویش یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے عمل میں آزاد ہے لیکن درحقیقت وہ غیر شعوری طور پر منڈی کی بیوپاری اقدار میں کلیتاً جکڑا ہوتا ہے۔ وہ یہ سمجھ کر لوگوں سے رشتے ناطے جوڑتا ہے کہ ان تعلقات کی وجہ سے وہ اپنی تنہائی کے روگ کا مداوا کر سکے گا۔ لیکن کاروباری رشتوں کے ہجوم میں ہر کوئی تنہا ہوتا ہے۔ تنہاؤں کا ہجوم، مشینی پرزوں کا ہجوم، تنخواہ اور منافع کے مقناطیس سے جڑے ہوئے آٹومیٹن کہلانے والے کل پرزوں کا ہجوم، یہ اس قسم کے مکینیکل اور بیوروکریٹک بندھنوں کا ہنگامہ خیز اجتماع ہوتا ہے کہ اس کے شور میں ہر شخص مفاد پرستی کی اندھی دوڑ میں دوڑتا چلا جاتا ہے اور اسے ہوش ہی نہیں رہتا کہ وہ تو تنہا ہے۔ اس کے ساتھ بھاگنے والے دراصل اس کے ساتھ مل کر نہیں بھاگتے بلکہ اس کے مقابلے میں بھاگ رہے ہوتے ہیں۔ اس دوڑ میں کوئی ایک جب ٹھوکر کھا جاتا ہے تو دوسرے اس کو اپنی ایڑیوں کے نیچے کچلتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ اس طرح کے کاروباری تعلقات بیگانگی اور اجنبیت میں مزید اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ تنہائی اور عدم تحفظ کا روگ مزید شدت اختیار کر جاتا ہے۔

لہٰذا اس نوع کے تمام تعلقات جو انسان اپنے جیسے دوسرے انسانوں سے تنہائی اور عدم تحفظ کے جذام سے محفوظ رہنے کے لئے قائم کرتا ہے وہ نہ صرف یہ کہ اس کی تنہائی اور عدم تحفظ کے احساس کو خطرناک حد تک بڑھا دیتے ہیں بلکہ اس کے انفرادی اور جداگانہ تشخص کو بھی پامال کر دیتے ہیں۔

ان حالات میں ہمارے پاس صرف وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار کی بنیاد پر بنی نوع انسان سے رشتے ناطے جوڑنے کا انسان دوست قاعدہ یا ڈھنگ باقی رہ جاتا ہے۔ آیئے ایسے رشتے ناطوں کی نوعیت کو سمجھیں جو مستقل اقدار کی روشنی میں استوار ہوتے ہیں۔

مستقل اقدار کی بنیاد پر قائم کردہ انسانی تعلقات

پہلی قدر۔ احترامِ آدمیت قرآنِ پاک کا بنیادی اور اوّلیں اصول تکریم انسانیت ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے ولقد کرمنا بنی آدم۔ مفہوم اس کا یہ ہے کہ ہر انسان انسان ہونے کی جہت سے عزت اور تکریم کا سزاوار ہے۔

دوسری قدر۔ حقیقی آزادی اس حقیقی آزادی سے انسان اُسی وقت ہمکنار ہو سکتا ہے جب کوئی فرد کسی دوسرے فرد کو اپنے مفاد کے حصول کے لئے آلۂ کار کے طور پر استعمال نہ کر سکے۔ ہر شخص اپنے جداگانہ تشخص کا حامل ہو اور خدائی صفات کو اپنے اندر جذب کرنے کے لئے کوشاں ہو۔ یہ حقیقی آزادی اُسے قرآنی معاشرہ میں نصیب ہوتی ہے جہاں وہ اپنی سنگت کی وجودی ضرورت کی تسکین دوسروں سے تعاون کی صورت میں کرتا ہے۔

تیسری قدر۔ تعاون انسان جب دوسروں سے تعاون کرتا ہے تو وہ تنہائی کے آسیب کی گرفت سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس تعاون کی ماہیت بھی قرآنِ کریم نے واشگاف الفاظ میں بیان کر دی ہے ارشادِ خداوندی ہے۔ تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى (۵/۲)۔ مفہوم:۔ "زندگی کی کشادگی کی راہوں میں اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کے معاملات میں ایک دوسرے سے تعاون کرو"۔ تعاون کی شرح یہ ہے کہ مقصد اجتماعی ہو جس کے لئے تعاون کیا جائے۔ جو سب کو نوعِ انسانی کی منفعت اور بھلائی کی طرف لے جائے۔

چوتھی قدر۔ مساوات اس قدر سے مفہوم یہ ہے کہ دوسروں سے تعلقات برابری کی بنیاد پر قائم ہوں اور کسی کے اختیار اور ارادے کو سلب نہ کیا جائے۔ محمود و ایاز کی تقسیم مٹ جائے اور سب ایک ہی صف میں کھڑے ہو جائیں۔ اذیت رسانی اور اذیت طلبی کی بجائے فیض رسانی کا سلسلہ عام ہو جائے۔ احتیاج کا قلع قمع ہو جائے جو ایذا کوشی اور ایذا طلبی کی جانب مائل کرتی ہے۔ انفاق کو احتیاج کے سدباب کے لئے اختیار کیا جائے۔

پانچویں قدر۔ انفاق انفاق سے مفہوم یہ ہے کہ رزق کے سرچشموں کو مستضعفین کی نشوونما کے لئے کھلا رکھا جائے۔ نظامِ ربوبیت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ قائم ہو جس میں سائلین اپنے لئے سامانِ نشوونما بطور حق طلب کر سکتے ہوں۔ (حق معلوم للسائل والمحروم (۷۰/۲۵)۔

چھٹی قدر۔ عدل و احسان اِنَّ اللّٰہ یامر بالعدل والاحسان (۱۶/۹۰) "اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔" عدل کے معنی ہیں برابر برابر کر دینا۔ جو کچھ کسی کا واجب ہے وہ دے دینا۔ اس سے ظلم کی روک تھام ہوگئی اور ایذا کوشی کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ (ظلم کے معنی ہیں کسی کے حقوق میں کمی کرنا) اور احسان کے معنی ہیں کسی کی کمی کو پورا کر کے اس کے بگڑے ہوئے توازن کو برقرار کر دینا۔ اس احسان کی قدر سے ایذا طلبی کا خاتمہ ہو جاتا ہے کیونکہ ایذا طلب شخص نفسیاتی مریض ہوتا ہے۔ اس کا وجودی توازن بگڑا ہوتا ہے اس لئے، قدرِ احسان، کے مطابق مسلم معاشرے کا فرض ہے کہ اس کے بگڑے ہوئے توازن کو خوشگوار، مثبت اور پیداواری تدبیروں سے درست کر دے۔

ساتویں قدر۔ کوئی محکوم نہ ہو انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت اپنی آزادی کا تحفظ اور تنہائی کے روگ کا علاج ہے۔ آزادی کا تحفظ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر حکومت نہ کر سکے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔ "کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اسے ضابطہ قوانین، حکومت اور نبوت (تک بھی) عطا کرے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کی نہیں بلکہ میری محکومیت اختیار کرو۔" (۳/۷۹)۔ اس اصول نے ایذا کوشی کی جڑیں کاٹ دیں۔ انار کی اور طوائف الملوکی سے بچنے کے لئے صرف کتاب اللہ کے قوانین اور اقدار کی محکومی اختیار کی جائے گی جس کے نتیجے میں سب انسان ربانی بن جائیں گے۔

پس ثابت ہوا کہ قرآنی اقدار کی روشنی میں انسانی رشتے ناطے جوڑنے سے نہ "وجودی آزادی" سے فرار کی ضرورت باقی رہے گی نہ اس قسم کی آزادی سے تنہائی کا خوف دامنگیر ہوگا۔

ضرورتِ رشتہ

دو بچیاں، عمر ۲۵/۲۲ سال، خوش قامت، تعلیم بی اے۔ قرآنی فکر رکھنے والے خود کفیل لڑکوں کے والدین رابطہ قائم کریں۔

ح ح معرفت ایڈیٹر ماہنامہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی، گلبرگ ۲۔ لاہور

حقائق و عبر

حسنِ اخلاق کا جوہر پیدا کیجئے!

"امت پر جب ہمہ وقتی زوال آیا تو اخلاقیات کے باب میں بھی بہت سی کمزوریاں در آئیں اور آج صورتحال یہ ہے کہ وہ امت جس کے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لئے تشریف لائے تھے اس کی اکثریت اخلاق و کردار کے جوہر سے محروم ہو گئی ہے۔" (ہفت روزہ اہل حدیث ۹ جولائی ۱۹۹۳ء)

طلوعِ اسلام

بجا فرمایا آپ نے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے

"

امامت کے جھگڑے پر خانہ خدا میدانِ کارزار بن گیا

گالی گلوچ اور دھینگا مشتی کے بعد فائرنگ سے بھگدڑ مچ گئی کئی ضعیف نمازی کچلے گئے، کونسلر کا سر پھٹ گیا۔

فائرنگ کرنیوالوں نے مسجد کی چھت پر پوزیشنیں سنبھال لیں، جڑانوالہ کی جامع مسجد اہل حدیث میں پولیس متعین کر دی گئی۔

جڑانوالہ (نامہ نگار) مقامی جامع مسجد میں نماز کے دوران امامت کے جھگڑے پر گالی گلوچ کے بعد فائرنگ سے بھگدڑ مچ گئی اور کئی ضعیف العمر نمازی پیروں تلے روندے گئے، مقامی کونسلر میاں منیر احمد بھٹی کا سر پھٹ گیا جس کے بعد مسجد میں پولیس متعین کر دی گئی۔ مرکزی جامع مسجد اہل حدیث غلہ منڈی میں نماز ظہر کی جماعت کے لئے صفیں باندھی جا رہی تھیں کہ بعض

نمازیوں نے امام مسجد کو دھکا دے کر دوسری طرف گرا دیا اور اس کی جگہ نیا امام مسجد کھڑا کر دیا۔ نمازیوں کے ایک گروپ نے نئے امام مسجد کو قبول کرنے اور اس کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کر دیا جس سے مسجد کے اندر لڑائی جھگڑا شروع ہو گیا، فریقین نے ایک دوسرے کو گالیاں دیں، گھونسے مارے۔ اسی اثنا میں بعض مسلح افراد بھی مسجد میں داخل ہو گئے، جنہوں نے فائرنگ کرنے کے بعد مسجد کی چھت پر چڑھ کر پوزیشنیں سنبھال لیں، فائرنگ سے نمازیوں میں بھگدڑ مچ گئی اور وہ اپنی جانیں بچانے کے لئے بھاگ کھڑے ہوئے جس کے نتیجہ میں کئی ضعیف العمر نمازی پیروں تلے روندے گئے۔ اطلاع ملنے پر پولیس نے پہنچ کر صورتِ حال پر قابو پایا۔"

(روزنامہ جنگ)

"یہ اُمّت روایات میں کھو گئی"

"حنفی، مالکی، شافعی و حنبلی مسلک تو تھے ہی کہ مسلم سیاسی افق پر وراثتی خاندان و قبائل ابھر آئے۔ اموی، عباسی، فاطمی، ہاشمی و خوارج کا زور ٹوٹنے کے بعد ترکوں نے حلقہ بگوشِ اسلام ہو کر خلافت سنبھال لی جو آخر کار سلطان عبدالحمید کے سلطنتِ عثمانیہ سے معزول ہوتے ہی ختم ہو گئی۔ اس طرح امتِ مسلمہ کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ سنی شیعہ تنازعہ اس پر مستزاد رہا۔

طلوعِ اسلام کا ایک مقصد نسلی و قبائلی عصبیت کا خاتمہ بھی تھا تاکہ مسلمان بہ حیثیت ایک ملت اور کنبہ کی طرح رہیں۔ قبیلہ و قومیت صرف شناخت یا پہچان کے لئے تھے نہ کہ باہمی جنگ و جدل و قتال یا آپس کی فرقہ بندی کے لئے، اسلام نے تو ایک دوسرے کے دشمن قبائل کو باہم ملا کر شیر و شکر کر دیا تھا۔ تمام عصبیتیں روند ڈالی تھیں۔ عالمگیر بھائی چارہ قائم کیا تاکہ مسلمان ایک عظیم معاشرہ میں زندگی گزار سکیں اور ایسا ہوا بھی جیسا کہ تاریخ شاہد ہے۔ قرونِ وسطےٰ کے مسلمان محض اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لئے وقف تھے۔ مسلمانوں نے جب اسلامی اصولوں کو چھوڑ دیا تو اللہ کی حمایت سے محروم ہو کر ٹکڑیوں میں بٹ گئے۔ عروج زوال میں تبدیل ہو گیا۔ پسماندگی اور جہالت امتِ مسلمہ میں در آئی۔ عصبیتیں ابھر آئیں۔ تضادات نے جنم لیا۔ یوں مسلمانوں نے از خود اپنی زندگیوں کو جہنم کا نمونہ بنا لیا۔ اسلام سے قبل کے جاہلیت کے دَور نے پھر ڈیرہ جما لیا۔ شیطانی وسوسوں نے مسلمانوں کو کہیں کا نہ رکھا۔ عزت و وقار رخصت ہوا۔ غیر اقوام نے انہیں محکوم بنا لیا۔ آج بھی ذہنی طور پر ہمارا پڑھا لکھا طبقہ مغرب کا غلام ہے۔ ہمارے قول و فعل میں تضاد ہے۔

اپنی بربادی کا ذمہ دار ہم اغیار کو ٹھہراتے ہیں اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھئے تو اس کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔

آج کتنے فرقے کتنے مسلک ہیں جو مسلمانوں کو فرقہ واریت کی نذر کئے ہوئے ہیں۔ ہم شیعہ، سنی، حنفی اہلحدیث، وہابی دیوبندی، بریلوی مسالک کے جال میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ اخلاقیات اور برداشت سے عاری ہیں۔ دنیا کی کوئی برائی نہیں جو ہم میں موجود نہ ہو۔ ایسے حالات میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا خواب دیکھنا احمقوں کی جنت میں رہنے کے مترادف ہے۔ سود و حرام خوری ہمارے خون میں رچ بس گئی ہے۔ ہمیں حرام و حلال کی تمیز نہیں رہی۔ مغرب کی نقالی عام ہے۔ مسلم معاشرہ تلپٹ ہو کر رہ گیا ہے۔ تبلیغ دین، حصول علم و ہنر، تحقیق و تفتیش اور اسلامی روح جہاد کے بجائے ہم فروعات خرافات و روایات میں کھو کر رہ گئے ہیں۔ کیا یہی ہمارے پنپنے کی باتیں ہیں۔ اس بنیاد پر ہم اسلام اسلام کرتے رات دن نہیں تھکتے، جب کہ اسلامی کردار و اقدار کو ہم نے اپنی زندگی سے خارج کیا ہوا ہے۔

فیصلہ دوٹوک ہے کہ جب تک امتِ مسلمہ دقیانوسی سوچ و عمل سے پیچھا نہیں چھڑائیگی اور موجودہ زمانے کے ساتھ قدم ملا کر اپنی برتری ہر میدان میں ثابت نہیں کرے گی، اسلام کی نشاۃِ ثانیہ تو دُور کی بات ہے خود مسلمانوں کی زندگی نہیں سنور سکتی۔ عالمی کفر ہمیں کچوکے لگاتا رہے گا اور ہم بے بسی کی دلدل میں پھنسے اور پھنسے رہیں گے کہ اللہ نے اس قوم کی حالت آج تک نہیں بدلی جو خود اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش نہ کرے۔ خالی خولی باتوں کی بجائے عمل شرط ہے۔ اسی عملِ حسنہ کے بل پر سب کچھ موقوف ہے۔

ہم سب کو معلوم ہے کہ ہماری نئی نسل کس طرف جا رہی ہے۔ کیا یہ از خود ایسا ہو گیا ہے جی نہیں بلکہ اس میں سراسر ہمارے اسلاف کا قصور ہے اور سب سے بڑھ کر ہمارا خود کا وہ عمل ہے جو ہم نے نئی نسل کو ودیعت کیا ہے۔ بچہ وہی کچھ سیکھتا ہے اور کرتا ہے جو اس کے بڑے کرتے ہیں۔ ہماری تربیت ناقص اور تعلیم کا فقدان ہے۔ ماحول ہمارے بچوں کے خلاف ہے۔ یہ حالات ہم نے پیدا کئے ہیں۔ انہیں بدلنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ کیا اصلاحِ احوال فرشتے آکر کریں گے؟ اس کے لئے ہم سب کو مل کر کوشاں ہونا ہوگا۔ ابتدا اپنے گھروں سے کرنا ہوگی ورنہ دیگراں را نصیحت خود را فضیحت کے مصداق آنے والی نسل بھی ہمارا

مضحکہ ہی اڑائے گی کہ چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں بڑے میاں سبحان اللہ۔

ہمیں وجہ ہمیں آپس کے اختلافات سے قطع نظر اپنانا ہوگی۔ تفرقات و فرقہ واریت سے پیچھا چھڑانا ہوگا۔ اسلامی بھائی چارہ و عمدہ اخلاق کی داغ بیل پھر سے ڈالنا ہوگی۔ اتحاد اتفاق ہماری زندگی کا مقصد ہونا چاہیئے۔ اسوۂ حسنہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل ہمیں دنیاوی آفات و اخروی نجات میں سرخرو کرے گا۔ تعلیم و تحقیق کے زیور سے امتِ مسلمہ کو سجانا ہوگا۔ اپنے وسائل کے مطابق ایک دوسرے کی مدد کرنا ہوگی۔ قومیت، عصبیت اور انسانوں کے بنائے ہوئے نظاموں کو خیرباد کہہ کر اسلامی طریق پر زندگی گزارنا ہوگی تاکہ ایک صحیح اسلامی ریاست کی شروعات کر سکیں جو جغرافیائی حدود سے ماورا ایک جسم کی طرح ہوگی جس کے عضو کا ہر درد وہ محسوس کرے گا اور اس کا مداوا اس کے دائرۂ اختیار میں ہوگا صالح قیادت کی زیرِ نگرانی امتِ مسلمہ اس طرح پھر اپنی منزل کو پالے گی جس کے لئے وہ صدیوں سے ترستی رہی ہے۔ ایک مثالی اسلامی معاشرہ ابھر کر سامنے آئے گا جس کی تقلید دیگر اقوام اپنے لئے باعثِ افتخار سمجھیں گی۔ جیسا کہ ہمارے علم و تحقیق کے سوتوں سے پہلے بھی تاریک تر اعظم یورپ منور ہو چکا ہے۔ یہ اسپین کے مسلم اکابرین و علماء زمانہ کا کارنامہ ہے جو تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔ کیا یہ کارنامہ پھر نہیں دہرایا جا سکتا؟ گھڑے ہوئے قصے کہانیوں، الٹی سیدھی روایات اور مصنوعی زندگی اپنا کر ہم نے اپنا بیڑہ غرق کر رکھا ہے۔ ترقی اور سوچ کے تمام دروازے اپنے پر بند کر لئے ہیں۔ اپنے دین میں ہم نے سوائے روایتی طرز کے اور کونسی تحقیق سرانجام دی ہے اس کو کتنا پھیلایا ہے۔ کون سا جہاد ہم کر رہے ہیں۔ ہماری جدّوجہد کیا ہے اور ہماری منزل کے نشان کہاں ہیں۔ مال و دولت ہی ہمارا دین و ایمان ہو کر رہ گیا ہے جس کے لئے ہم سرگرداں ہیں۔ پیسہ کمانا بھی محض اس لئے کہ کہیں ہم مغرب کی پیروی اور نام نہاد ترقی میں پیچھے نہ رہ جائیں۔ ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں۔"

(میاں مختار احمد بشکریہ الفجر)

طلوعِ اسلام

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

تحریکِ خلافت = { (جماعت اسلامی + تبلیغی جماعت) - مذہبی ٹریڈ یونینز }

امیر تنظیم اسلام اور تحریک خلافت جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اپنے جریدے میں تذکرہ و تبصرہ کے عنوان کے تحت رقمطراز ہیں:-

"اس ملک میں "دینی اور انقلابی تحریک" صرف ایک تھی اور وہ جماعت اسلامی تھی یہاں "دینی" اور "انقلابی" کے الفاظ کی اہمیت پیش نظر ہے۔ میرے نزدیک جماعت اسلامی ایک "مذہبی" نہیں "دینی" اور ایک "سیاسی جماعت" نہیں بلکہ "انقلابی تحریک" تھی۔ لیکن اب جو صورت حال ہے وہ بالکل مختلف ہے۔ اس نے سیاست کے میدان میں آکر اپنا "دینی" اور "انقلابی" ہونے کا کردار داغدار کر لیا ہے۔ باقی سب مذہبی جماعتوں میں دو وصف لازمی طور پر پائے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ "دینی" نہیں "مذہبی" ہیں یعنی ان کے سامنے نظام کا تصور نہیں ہے بلکہ دین صرف شریعت کے درجے میں ہے اور دوسرے یہ کہ وہ فرقہ دارانہ ہیں اور فرقہ وارانہ بنیاد پر سیاست کرتی ہیں۔ اہلحدیث، بریلوی اور دیوبندی مسلک کی جماعتیں اپنے اپنے فرقے کے نعرے لگا کر ووٹ لیتی ہیں۔ لہٰذا جہاں جہاں ان کے کچھ فرقہ وارانہ اثرات اور کچھ دائرۂ اثر و نفوذ ہے وہی ان کا سیاسی دائرہ کار ہے۔ میرے نزدیک ان کی اصل حیثیت علماء کی ٹریڈ یونینز کی ہے۔ جیسے ہر شعبے کی ٹریڈ یونینز ہوتی ہیں۔ ڈاکٹروں کی ٹریڈ یونینز، کلرکوں کی یونینز، اساتذہ کی یونینز، اسی طرح چونکہ مذہب بھی ہمارے ہاں ایک پیشے (PROFESSION) کا درجہ اختیار کر گیا ہے لہٰذا ان فرقہ وارانہ مذہبی جماعتوں کی حیثیت بھی ٹریڈ یونینز کی ہے، البتہ جہاں کہیں ان کا حلقۂ اثر ہے وہاں یہ سیاست بھی کرتی ہیں۔ تاہم ایک جماعت اس سے مستثنیٰ ہے۔ وہ خالص غیر سیاسی بھی ہے اور فرقہ واریت سے بالاتر بھی، مزید برآں تحریک بھی ہے اگرچہ انقلابی نہیں۔ یہ تبلیغی جماعت ہے۔ یہ ایک مذہبی تحریک ہے، ان کے ہاں دین یا نظام کا تصور نہیں ہے۔ ان کا سارا تصور مذہبی ہے جو عبادات، اتباع سنت اور فضائل اعمال وغیرہ تک محدود ہے۔ اسے آپ ایک اصلاحی تحریک کہہ سکتے ہیں لیکن دینی تحریک اس معنی میں نہیں کہ نظام بدلنے میں کوشاں ہو۔

میں نے اپنے امکان بھر جو کوشش کی تھی وہ یہ تھی کہ جماعت اسلامی کے اصولی دینی انقلابی فکر اور تبلیغی جماعت کے تعبدی انداز کو ایک جماعت میں جمع کر دیا جائے۔ یعنی یہ تصور بھی واضح رہے کہ دین اور دنیا ایک وحدت ہیں اور دین کے اجتماعی نظام کو قائم کرنا اور دین کے غلبہ کی جدوجہد کرنا ہمارا فرض ہے لیکن یہ جدوجہد کرتے ہوئے عبادات سے شغف اور اتباعِ سنت کے رنگ کو اپنی شخصیتوں کے اندر پختہ کیا جائے، گہرا اتارا جائے۔"

(ماہنامہ میثاق بابت جولائی ۱۹۹۳ء، ص ۴۴-۴۵)

طلوعِ اسلام

بات صاف ہوئی۔ اب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب یا ان کی تنظیم کو سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آنی چاہیئے۔

اسلامی جماعتوں کا غیر اسلامی کردار

"علامہ اقبالؒ نے ایک مخلوق کے متعلق فرمایا تھا:

زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے
غضب ہے سطرِ قرآں کو چلیپا کر دیا تُو نے

کس مخلوق کے متعلق یوں فرمایا تھا؟ حافظے پر تھوڑا سا زور دینے سے بآسانی پتہ چل جاتا ہے اس لئے کہ یہ مخلوق اسلامی دنیا میں عام پائی جاتی ہے۔ پاکستان میں بھی اس کی کوئی کمی نہیں۔ اس مخلوق کا ہر فرد اکثر و بیشتر آپ کو ایک منجھا ہوا دیدہ ور، خوش پوش دانش ور، باذوق خورونوش کا رسیا، پیشہ ور مقرر، طرح دار خطیب، وضع دار مجمع باز، نقطہ پرور نقاد، اور گول مٹول سیاستدان نظر آئے گا۔ بالعموم مشرع، واسکٹ پہنے ہوئے، جناح کیپ یا عمامہ سر پر اوڑھے ہوئے، تیکھے نقوش، عقلِ کُل کا داعی اور بظاہر ہمہ صفت معلوم ہوگا۔ یہ ہے ہمارا وہ دینی سیاسی رہنما جس کے دعوے ہمالہ سے بلند لیکن پرواز اتنی محدود کہ ہمیشہ سیکولر عناصر کا ضمیمہ بننے کا عادی، زبیں پاؤں سے سرکتی ہے اور قلم لکھنے سے جھجکتا ہے کہ اس مخلوق سے دین کی آڑ میں اکثر بے دینی ہوتی رہتی ہے۔"

(ماہنامہ سبق پھر پڑھ، جولائی ۹۳ء، ص ۳)

طلوعِ اسلام: اللہ انہیں ہدایت دے۔

شروط صحیح بخاری

"امام بخاریؒ نے صحیح البخاری کی ترتیب میں بڑی کڑی اور سخت شروط کا اہتمام کیا۔ اسی وجہ سے ہی صحیح البخاری کو صحیح ترین کا لقب ملا۔ لہٰذا کوئی ناقد و معاند صحیح البخاری میں صدیوں سے ایک حدیث پر بھی انگلی نہیں اٹھا سکا۔ شروط یہ ہیں۔

- صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سب کے سب راوی اعلیٰ درجہ کے ثقہ ہوں۔ اور ان کی ثقاہت پر (علماء جرح و تعدیل) کا اتفاق ہو۔ یعنی تمام راوی مسلم صادق غیر مدلس غیر مختلط متصف صفاتِ عدالت، ضابط، متحفظ، سلیم الذہن، قلیل الوہم اور سلیم الاعتقاد ہوں۔
- سلسلۂ روایت منقطع نہ ہو۔
- اگر روایت معنعن ہو تو راوی کی اپنے شیخ سے ملاقات (لقا) ثابت ہو۔
- جن احادیث پر سابق محدثین اور ان کے ہم عصر محدثین کا اتفاق ہو۔
- حدیث علت اور شذوذ سے خالی ہو۔

(ہفت روزہ اہلحدیث، ۹ جولائی ۹۳ صـ۶)

طلوعِ اسلام

صحیح بخاری، امام محمد بن اسمٰعیل البخاریؒ نے چھ لاکھ حفظ شدہ احادیث سے منتخب کر کے ترتیب دی۔ اس میں کُل احادیث کی تعداد ۷۵۶۳ ہے۔ ان میں سے مکررات، متابعات، معلقات اور موقوفات کو حذف کر دیا جائے تو صحیح احادیث کی تعداد ۲۶۰۲ رہ جاتی ہے۔ گویا امام بخاریؒ نے اپنے دور میں موجود ۵,۹۲,۴۳۷ حفظ شدہ احادیث کا انکار فرمایا۔ جس سے احادیث کا ۹۸٫۷۵ فیصد ذخیرہ آنے والی نسلوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ پانچ کسوٹیاں جن پر پرکھ کر امام صاحب نے صحیح احادیث کا انتخاب فرمایا، ان میں قرآن شامل نہیں۔

نقد و نظر

نام کتاب : پاکستان حشیش سے ہیروئن تک
مصنف : اکرام الحق
ناشر : محمد عمر دراز، چیف ایگزیکٹو النور پرنٹرز و پبلشرز،
مطبوعہ : النور پرنٹرز و پبلشرز، ۳/۲ فیصل نگر، لاہور،
ایڈیشن : اوّل (اردو) ۱۹۹۳ء، قیمت : ۸۰/۰۰ روپے، پیپر بیک، خوبصورت سرورق۔

○

منشیات کی وبا نے کس طرح ہمارے مختلف گوشہ ہائے حیات کو اپنی تباہ کن لپیٹ میں لے رکھا ہے، ہر حساس انسان اس سے لرزاں ہے۔ یہ کتاب جو پاکستان کی اس مہلک وبا کی ابتدا اور تدریجی پھیلاؤ کی مکمل داستان ہے، مصنف کی برسہا برس کی تحقیقی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

ہم موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اس کتاب پر بھرپور تبصرہ کرنا چاہتے تھے لیکن ہم نے دیکھا کہ کتاب کے ناشر جناب محمد عمر دراز صاحب نے 'حرفِ ناشر' کے تحت جس خوبصورتی سے اس پر روشنی ڈالی ہے، اس سے بہتر تبصرہ شاید محال ہو۔ لہٰذا ہم اسے من و عن شائع کر رہے ہیں، ہمیں امید ہے کہ موضوع پیش نظر پر یہ عمدہ کتاب، پاکستان کی انسدادی کوششوں میں ایک گراں قدر معاونت کر سکے گی۔ اب آپ حرفِ ناشر ملاحظہ فرمائیں۔

○

خالقِ کائنات کے نزدیک انسانی جان کی قدر و قیمت کیا ہے اسے یوں بیان کیا گیا کہ:

انہ من قتل نفساً بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعاً
ومن احیاھا فکانما احیا الناس جمیعاً..... (۵/۳۲)

"جو شخص کسی دوسرے شخص کی جان لے لے، بجز اس کے کہ ایسا، جرم قتل کے قصاص میں ہو (یعنی قتلِ ناحق کے لئے سزائے موت کے طور پر) یا ملک میں فساد برپا کرنے والے مجرمین کو قانون کے مطابق موت کی سزا دی جائے..... تو اس قسم کے بے گناہ قتل کے متعلق یوں سمجھو کہ گویا کہ اس شخص نے (ایک فرد کو قتل نہیں کیا) پوری کی پوری نوعِ انسانی کو قتل کر دیا۔
اس کے برعکس، جس شخص نے کوئی ایک جان بچالی تو اس نے گویا پوری نوعِ انسانی کو

زندگی بخش دی"
انسانی جانوں سے کھیلنے والے، اللہ کے اس ارشاد کے مطابق، نوعِ انسانی کے قاتل ہیں۔ اس مکروہ کاروبار سے انہیں [خوا]ہ کتنے ہی دنیاوی فوائد حاصل کیوں نہ ہو جائیں، اللہ کے قانون کے مطابق یہ وہ جرم ہے جس کی سزا انہیں دائمی [جہنمی] زندگی کی صورت میں ملے گی اور کرۂ ارض پر کوئی گوشہ ایسا نہیں جو اللہ کے قانون کی کارفرمائی سے باہر، جہاں انسان [نک]ل کر اس سے پناہ لینے چلا جائے۔ وہ تو ہر جگہ اور ہر وقت اللہ کی تمام مخلوق کو اپنے احاطہ میں لئے رہتا ہے (۲:۱۹؛ ... ؛ ۸۱:۴۷؛ ۱۸۴:۱۱ و دیگر متعدد آیاتِ قرآنی)۔ صرف اتنا ہے کہ اللہ نے انسان کی اصلاح کے لئے اپنے قانون [مکاف]ات سے، جرم کے سرزد ہونے اور اس کا نتیجہ نکلنے میں، جو وقفہ، مہلت ٹھہرا رکھا ہے، اس سے بعض انسان غلط [اندا]زہ لگا لیتے ہیں کہ انہیں کوئی پکڑنے والا نہیں۔
اس کے برعکس انسانی جان کی حفاظت کرنے والوں کا مقام یہ ہے کہ وہ پوری کی پوری نوعِ انسانی کو زندگی دینے [والو]ں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اگر بنظرِ تعمق دیکھا جائے تو کسی انسان کا ایسا حیات بخش عمل، اللہ تبارک و تعالیٰ کے ساتھ [رفا]قت کا عمل ہے، اس اللہ کے ساتھ رفاقت، جو خالق کائنات ہونے کے ساتھ ساتھ ربِّ کائنات اور حیّ و قیوم ہے یعنی [زند]گی کی بقا اور سلامتی کے لئے وسائل و ذرائع ذرائع مہیا کرنے والے۔
منشیات کے سوداگر اپنی محدود دنیاوی زندگی کے فوائد کے لئے جس طرح انسانی جانوں سے کھیل رہے ہیں، [یہ ک]تاب اسی کی داستان ہے۔ اب سوائے ان کے اپنے گروہوں کے، ہر انسان اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ وہ [قات]لِ بنی نوعِ انسان ہیں۔ شاید وہ بھی یہ جانتے ہوں لیکن منشیات کے کاروبار سے حاصل ہونے والی بے بہا دولت نے [ان] کی عقل و ہوش پر پردے ڈال رکھے ہیں۔ ان کی حالت یہ ہے کہ

پتا پتا، بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے

ان کی پھیلائی ہوئی معاشرتی اور معاشی تباہیوں کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کا شمار اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے [مطا]بق نوعِ انسانی کو زندگی دینے والوں میں سے ہیں۔
اس کتاب کے مصنف ان خوش نصیب اصحاب میں سے ہیں جنہیں بتوفیق ایزدی، انسانیت کے لئے [زند]گی بخش اعمال کی سعادت میسر آئی اور یہی وہ واحد مقصد میرے پیشِ نظر تھا جب میں نے دنیاوی فوائد و حاصلات سے [بالات]ر اس کتاب کے پہلے اور انگریزی ایڈیشن کا ناشر بننا پسند کیا۔ ہماری اس پیشکش کی نہ صرف وطنِ عزیز [میں تح]سین آفرینی کی گئی بلکہ بین الاقوامی سطحوں پر بھی اسے پذیرائی ملی۔ لیکن اس کتاب کے انگریزی زبان میں ہونے کی وجہ [سے ا]س کے مندرجات کی عامۃ الناس تک رسائی نہ ہو سکی۔

دراصل انگریزی زبان کی کتابوں کا مطالعاتی طبقہ، ڈرائنگ روم مطالعاتی طبقہ (DRAWING ROOM READERSHIP) ہوتا ہے جو ڈرائنگ روم میں بیٹھے کتاب کی تعریف کرتا ہے اور پھر اسے اپنی لائبریری کے کسی خانے (SHELF) میں سجالیتا ہے۔ انگریزی زبان کی کتابوں کا پیغام ہمارے عوام تک نہیں پہنچتا۔ اس لئے میں نے اس کے اردو ایڈیشن کی اہمیت کے پیشِ نظر مصنف سے اس کے اُردو ترجمہ کی ضرورت پر گفتگو کی اور ان سے اُردو ترجمہ شائع کرنے کی اجازت حاصل کی۔

میں اس کتاب کا ترجمہ خود کرنا چاہتا تھا لیکن اپنی بعض دوسری اہم مصروفیات (جو اسی قدر اہم ہیں) کی بنا پر ایسا کرنے کی اپنے اندر ہمت نہیں پاتا تھا۔ ساتھ ہی میری یہ خواہش شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی کہ اردو ترجمہ جلد شائع ہونا چاہیئے تاکہ یہ مہلک وبا جس سرعت سے ہماری (بالخصوص) نوجوان نسل کو بلیک ہول (BLACK HOLE) کی طرح اپنے اندر کھینچے چلی جارہی ہے اس کا کچھ تو سدِباب ہوسکے۔ چنانچہ اس کا ترجمہ کرایا گیا، پھر اس کی تھوڑی بہت نوک پلک سنواری گئی اور اب یہ کتاب پیشِ خدمتِ قارئین ہے۔

جیسا کہ اس کتاب کے مطالعہ سے ثابت ہوگا، منشیات کی وبا پر صرف انسدادی ضابطوں سے قابو نہیں پایا جاسکتا اس کے لئے ضروری ہے کہ عوام میں یہ شعور عام کیا جائے کہ ہیروئن اور دیگر نشہ آور اشیاء کے استعمال کرنے والے صرف اپنی زندگی ہی سے نہیں کھیل رہے ہوتے بلکہ ہمارے پہلے سے زبوں حال معاشرہ کی مشکلات میں کس قدر اضافہ کررہے ہیں۔ دراصل منشیات زدگی عام قتلِ انسانی ہے۔

اگر یہ کتاب اپنا مذکورہ مقصد حاصل کرسکے تو امید ہے کہ اس کا شمار رب العالمین کے فرمان کے مطابق، انسانی زندگیوں کو بچانے والے اعمال میں ہوجائے گا اور اس طرح قانون نافذ کرنے والے اداروں اور دل سے چاہنے والے صاحبانِ اقتدار اور بین الاقوامی ایجنسیوں کی کوششوں کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں ایک گراں قدر کردار ادا کیا جاسکے گا یہ امر اب مسلّم ہے کہ حکومتی کوششوں کے ساتھ عامۃ الناس کا اس ہلاکت آفریں وبا کے متعلق حقیقی شعور ہی باہم ملکر شاید اس کا کچھ سدِباب کرسکیں اور ہماری موجودہ اور آنے والی نسلوں کو ایک ممکنہ تباہی سے بچایا جاسکے۔

میری خواہش ہے کہ اس کتاب کو اتنی تعداد میں اور اتنا سستا شائع کیا جائے کہ یہ قوم کے ہر فرد تک پہنچ سکے میرے اپنے وسائل انتہائی محدود ہیں اس لئے مجھے ایسے انسان دوست اصحاب کی تلاش ہے جو اس جہاد میں شامل ہوکر اتنے وسائل مہیا کرسکیں کہ ہر فردِ معاشرہ تک اس کتاب کی رسائی ممکن بنادی جائے یا پھر اسے عامۃ الناس تک مفت پہنچایا جاسکے۔ مجھے یقین ہے ایسے افراد کی ہمارے ہاں کوئی کمی نہیں۔ مجھے ایسی کسی پیش کش کا انتظار رہے گا۔

میں اپنی ان معروضات کو، مصنف کتاب کے ساتھ کامل ہم آہنگی میں اس دعا کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ رب العالمین ہمیں علم و دانش، فہم و فراست، عزم و حوصلہ اور ارادوں کی ایسی فراوانیوں سے بہرہ ور فرمائیں کہ اس کی مخلوق کو اس

عذاب سے بچایا جاسکے جو بیرونی اور دیگر نشہ آور اشیاء کی شکل میں اس پر مسلط ہوتا جارہا ہے۔

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

موصولہ عطیات بمعہ ڈان ماڈل سکول وتعمیر قرآنک ریسرچ سنٹر

نمبر شمار	اسم گرامی	رسید نمبر	مبلغ رقم
۷۳	ڈاکٹر زاہدہ درانی صاحبہ	۲۲۱	۲۰۰۰/- روپے
۷۴	میجر محمد یوسف ڈار صاحب	۲۲۴	۱۰۰۰/- "
۷۵	ڈاکٹر محمد اکرم مرزا صاحب	۲۳۴	۱۰۰۰/- "
۷۶	ڈاکٹر محمد اکرم مرزا صاحب	۲۳۵	۱۰۰۰/- "
۷۷	صوبیدار میجر محمود الحسن صاحب	۲۳۶	۱۰۰/- "
۷۸	حکیم رحمت علی صاحب	۲۳۷	۲۰۰/- "
۷۹	بیگم خورشید النسا رحمت علی صاحبہ	۲۳۸	۲۰۰/- "
۸۰	محمد محسن صاحب	۲۳۹	۱۰۰۰/- "
۸۱	شیر محمد صاحب	۲۴۰	۵۰۰۰/- "
۸۲	محترمہ شائستہ اشرف صاحبہ	۲۴۱	۱۰۰/- "
۸۳	میجر محمد یوسف ڈار صاحب	۲۴۲	۱۰۰۰/- "
۸۴	بزم طلوعِ اسلام کویت (بواسطہ ادارہ طلوعِ اسلام)	۲۴۳	۵۰,۰۰۰/- "
۸۵	کریم بخش صاحب	۲۴۴	۲,۰۰۰/- "
۸۶	غلام خان صاحب	۲۴۵	۵۰۰/- "
۸۷	میجر محمد یوسف ڈار صاحب	۲۴۶	۱,۰۰۰/- "
۸۸	عثمان نور صاحب	۲۴۷	۲,۰۰۰/- "
۸۹	شمشیر خان صاحب	۲۴۸	۵۰۰/- "

۹۰	محمد ظریف بھٹی صاحب	۲۴۹	۱۰۰/- روپے
۹۱	میجر محمد یوسف ڈار صاحب	۲۵۰	۱،۰۰۰/- "
۹۲	گلفراز احمد صاحب	۲۵۲	۱،۰۰۰/- "
۹۳	وقار احمد صاحب	۲۵۳	۲،۸۰۰/- "
۹۴	محمد بخش صاحب	۲۵۴	۲،۰۰۰/- "

ضروری تصحیح

طلوعِ اسلام بابت مارچ ۱۹۹۳ء میں شائع شدہ فہرست معطیاں میں نمبر شمار ۴۵ پر رشید احمد بٹ صاحب کی جانب سے موصولہ عطیہ بمطابق رسید نمبر ۹ مبلغ ۵۰۰/- روپے کی بجائے مبلغ ۲،۰۰۰/- روپے درست کر لیا جائے۔

تصحیح

مئی ۱۹۹۳ء کے شمارہ میں جناب ریاض راہی صاحب کا ایک قطعہ شامل کیا گیا تھا جو بقول شاعر اس طرح ہونا چاہیئے تھا ؎

ناصح نے کہا مجھ سے کہ از راہِ تاسف
ٹوٹے ہوئے کعبوں کو بھی دن رات پڑھا کر
لیکن مجھے کیا خوب کہا مردِ خدا نے
عبرت کے لئے اپنی روایات پڑھا کر

(ادارہ)

ملک خادم حسین۔ نمائندہ بزم طلوعِ اسلام۔ اوسلو

سالانہ رپورٹ

بزمِ طلوعِ اسلام (اوسلو) ناروے

سال ۱۹۹۲ء ایک لحاظ سے تحریکِ طلوعِ اسلام کے لئے ایک تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ یہ باب اس کی تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔ اس لحاظ سے کہ جس آواز کو دنیا کے ہر کونے میں دبانے کی کوشش کی گئی، جس کے خلاف پروپیگنڈا مشینری اس قدر تیز ہے کہ اس قرآنی آواز کے خلاف دینی اور اخلاقی اقدار کا بھی لحاظ نہ رکھا اور جہاں کہیں بھی موقع ملا بلا سوچے سمجھے، بلا تحقیق، محض مخالفت کی بنا پر اپنی کم ظرفی اور تنگ نظری کا مظاہرہ کیا۔

علامہ پرویزؒ کے خلاف غلط پروپیگنڈا جاری و ساری رکھا۔ اس پروپیگنڈے کو کسی حد تک روکنے کا مؤثر طریقہ یہی تھا کہ فکرِ قرآنی کو عام کیا جائے۔ اس دوڑ میں ٹی وی ای ایک مؤثر ذریعہ تھا جس کے لئے احباب نے تگ و دو شروع کی۔ یہ اس محنت کا نتیجہ ہے کہ یہ سعادت بزمِ طلوعِ اسلام اوسلو کے حصہ میں آئی کہ جناب علامہ پرویزؒ کے درسِ قرآن کا سلسلہ ۱۰ دسمبر ۱۹۹۲ء سے ہفتہ وار ٹی وی پر نشر ہونے لگا۔

اراکین و متفقین :۔ سال ۱۹۹۲ء میں اراکین و متفقین کی تعداد ۴۷ تھی جس میں مرد، عورتیں اور بچے شامل ہیں۔

اجلاس :۔ مشاورتی بورڈ کا اجلاس ہر ماہ کے آخری اتوار کو کسی ایک ممبر آف بورڈ کے گھر میں ہوتا ہے۔

ایجنڈا :۔ اجلاس سے دو تین دن پہلے ایجنڈا تحریری طور پر ہر ممبر کو پوسٹ کر دیا جاتا ہے تاکہ انہیں معلوم ہو کہ ایجنڈے میں کون کونسے نکات شامل ہیں۔

مشاورت :۔ ایجنڈے میں شامل نکات پر باہمی مشاورت کے بعد متفقہ فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اگر ایسی صورت ہو کہ کسی مسئلے پر اتفاقِ رائے نہ ہو سکے تو نمائندہ کا فیصلہ آخری فیصلہ سمجھا جاتا ہے۔ اس فیصلہ کو ادارہ میں چیلنج کیا جا سکتا ہے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ اس فکر سے تعلق رکھنے والے ہر فرد کو حق حاصل ہے کہ کوئی بھی مسئلہ جس کا تعلق تحریک سے ہو، ماہانہ اجلاس سے ایک ہفتہ قبل تحریری یا زبانی نمائندۂ بزم یا جنرل سیکرٹری تک پہنچائے تاکہ اس مسئلہ کو ماہانہ اجلاس میں شامل کر لیا جائے۔

سال ۱۹۹۲ء میں کل دس اجلاس ہوئے اور ۳، نکات زیرِ بحث آئے جن پر باہمی مشاورت سے فیصلے کئے گئے۔

پرچہ طلوعِ اسلام :۔ ماہنامہ طلوعِ اسلام کی ذمہ داری منظور احمد صاحب کی ہے۔ واضح رہے کہ سال ۱۹۹۳ء سے پرچے کا زرِ شرکت سالانہ ۱۰۰ کراؤن سے بڑھا کر ۱۳۰ کراؤن کر دیا گیا ہے اور زرِ شرکت پیشگی وصول کیا جاتا ہے۔

سال ۱۹۹۳ء کے لئے تمام احباب کو پوسٹ گیرو بھیجدیئے گئے ہیں۔ احباب سے گذارش ہے کہ رقم جتنی جلدی ہوسکے جمع کرادیں تاکہ پرچے کی ترسیل جاری رہے۔ جن احباب کو پرچے کا بل نہیں ملا براہِ کرم درج ذیل ٹیلیفون پر رابطہ کریں۔

منظور احمد ...... Tlf 22675662 ' صفدر حسین .... Tlf 22321063

خام ملک ...... Tlf 22610448۔

کتب :۔ طلوعِ اسلام کا جملہ لٹریچر اور درس کی وڈیو کیسٹ بزم اوسلو سے دستیاب ہیں۔ کتابوں کے سلسلہ میں پچھلے سال خاطر خواہ انتظام نہ ہوسکا جس کی وجہ سے بے شمار آرڈرز پورے نہیں کئے جاسکے۔ اس سال یہ رکاوٹ بھی دُور ہوگئی ہے، اس کے ساتھ ہی کتابوں کی قیمت بھی کم کر دی گئی ہے۔

لہٰذا احباب سے گذارش ہے کہ اپنی گھریلو لائبریری مکمل کرنے گفٹ سکیم کے تحت زیادہ سے زیادہ آرڈر ارسال کریں۔

اس کے علاوہ فکرِ قرآنی کی نشر و اشاعت کو مؤثر بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ہر فرد کم از کم دس کیسٹ اپنے گھر رکھے۔ قیمت فی کیسٹ پچاس کراؤن ہے۔

دیگر سرگرمیاں

درسِ قرآن :۔ اوکے برگ وائن ۵۶ کے شاندار ہال میں ہر ماہ کے پہلے اتوار کو شام چار بجے مفکرِ قرآن جناب علامہ پرویزؒ کا درس ہوتا ہے۔

تقاریر :۔ اکثر و بیشتر ہر ماہ کسی ایک فرد کو یہ موقعہ فراہم کیا جاتا ہے کہ وہ سلیم کے نام خطوط سے کسی منتخب موضوع پر تقریر کرے۔ اس طرح احباب کو طبع آزمائی کا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔

باہمی گفت و شنید :۔ عام طور پر درس کے بعد خواتین و حضرات چائے نوش فرماتے ہیں اور ساتھ ہی باہمی گفت و شنید یا تبادلۂ خیال بھی ہوتا ہے۔

غور و فکر :۔ بعض اوقات کسی خاص موضوع پر احباب کی رائے کے سلسلہ میں تین تین، چار چار آدمی گروپ کی شکل میں متذکرہ موضوع پر غور و فکر کے بعد گروپ کی رائے کو زبانی یا تحریری سب کے سامنے رکھتے ہیں۔

سیمینار :۔ پاکستان سے ایک علمی اور فکری شخصیت جناب عبداللہ ثانی ایڈووکیٹ کو ناروے آنے کی دعوت دی گئی اور ایک بڑے ہال میں سیمینار کا اہتمام کیا گیا۔ موضوع تھا ...

"قرآن کریم کا سیاسی اور معاشی نظام"۔ یہ سیمینار بے حد کامیاب رہا۔ اس کے علاوہ کم و بیش ۲۰ نجی محفلوں میں عبداللہ ثانی صاحب کے ساتھ فکرِ قرآنی کے حوالے سے مختلف موضوعات پر سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہا۔

اوسلو کے علاوہ فریڈرکستاد میں بشیر بٹالوی صاحب کے ہاں ایک محفل ہوئی۔ اس محفل میں موس سے احباب کے علاوہ ٹریشنلسٹ رسالہ کے مدیر جناب محمد رفیع صاحب بھی تشریف لائے۔

یومِ آزادی پاکستان:۔ ۱۴ راگست ۱۹۹۲ء کو HORTEN میں ایک منی جلسہ کا اہتمام کیا گیا جس میں ثانی صاحب نے ۱۴ اگست کے حوالے سے بتایا کہ پاکستان حاصل کرنے کا مقصد کیا تھا اور دو قومی نظریہ کیا ہے۔ اس کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ شروع کیا گیا اور خواتین نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

GEIRANGER کا ٹور:۔ عبداللہ ثانی صاحب کے ساتھ GEIRANGER جو نہایت حسین اور صحت افزا مقام ہے کی سیر کا پروگرام بنایا گیا۔ یہ ایک پرائیویٹ ٹور تھا جسے ثانی صاحب نے بہت پسند کیا۔ HYTTE اور خیمے کی زندگی کا تجربہ اکثر احباب کے لئے بالکل نیا تھا۔ ہماری رائے ہے کہ آپ احباب بھی بچوں کے ساتھ گرمیوں میں اس جگہ کی ضرور سیر کریں۔

بزمِ نونہال کے پروگرام:۔ بزمِ نونہال اپنے ابتدائی مرحلے میں ہے۔ مالی دشواریوں کے باعث بزم نونہال زیادہ پروگرام نہ کر سکی۔ آئندہ سال بچوں کے چند پروگرام زیرِ غور ہیں۔

اتحادِ ملی

جیسا کہ آپ کو علم ہے کہ اوسلو میں بے شمار تنظیمیں اپنے اپنے طور پر کام کر رہی ہیں۔ ان میں چند تنظیمیں ایسی ہیں جو بزعم خویش یہ سمجھتی ہیں کہ وہ تمام پاکستانیوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ حالانکہ کوئی بھی تنظیم ایسی نہیں جو تمام پاکستانیوں کی نمائندگی کرے۔ بزم طلوعِ اسلام نے ہمیشہ اور ہر جگہ یہ تجویز پیش کی کہ پاکستانیوں کی ایک نمائندہ تنظیم کی ضرورت ہے اور کوئی تنظیم موجود نہیں۔ اس سلسلہ میں پاکستان نارویجن ویلفیئر آرگنائزیشن کی طرف سے کوشش کی گئی۔ اس پہلی کوشش میں تنظیموں کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں ایسی ایک تنظیم کی ضرورت کو ناگزیر سمجھا گیا اور ایک رابطہ کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ رابطہ کمیٹی میں بزم طلوعِ اسلام اوسلو کو بھی نمائندگی ملی۔ بزم کی جانب سے منظور صاحب کو اس کمیٹی میں شرکت کے لئے منتخب کیا گیا۔ اس کمیٹی کے تین چار اجلاس ہو چکے ہیں اور کام کافی حوصلہ افزا ہو رہا ہے۔

بزم کا ایڈریس

BAZME TOLUE ISLAM OSLO

ELGTRAAKET - 71

1270 OSLO

بصد شکریہ .... بزم طلوعِ اسلام اوسلو۔

ooo

دوسری بزموں سے رپورٹ کا انتظار ہے۔

اے کاش!

☆... تحریر: ایم ایم بخاری

سری لنکا (سیلون) کے شہر کولمبو میں ایک اونچے طبقے کی اعلیٰ تعلیم یافتہ' خوشحال اور روشن خیال ہندو فیملی رہتی تھی۔ اپنی روشن خیالی ہی کی بنا پر یہ فیملی' ہندومت میں تنگ نظری کی وجہ سے مذہب سے متنفر تھی۔ اس فیملی میں ایک نوجوان لڑکا بھی تھا' جس کا صحیح نام تو یاد نہیں البتہ آپ اسے رام کہہ سکتے ہیں۔ رام غیر شادی شدہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ اس کے دوستوں میں مسلمان اور عیسائی لڑکوں کی کثیر تعداد تھی۔

جس علاقے میں رام کی رہائش تھی' اس کے قریب ہی ایک مسلمان خاندان بھی رہائش پذیر تھا اور اس خاندان کا ایک نوجوان لڑکا بھی رام کے دوستوں میں شامل تھا' اور غالباً اسی وجہ سے رام کی اس مسلمان گھرانے میں کافی آمدورفت تھی۔

اپنے والدین کی طرح رام بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ' شریف النفس اور روشن خیال تھا۔ چنانچہ اپنے مذہب یعنی ہندومت سے بیزاری کی بنا پر اس نے دوسرے مذاہب میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ وہ اکثر عیسائی مشنریوں کے پمفلٹ وغیرہ پڑھتا رہتا تھا۔ اس کی یہ دلچسپی دیکھ کر اس کے مسلمان دوست کے والد نے اسے مذہب اسلام کے متعلق ابتدائی معلومات کی کتابیں مہیا کرنا شروع کر دیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے مسلمان دوست کا خاندان صرف نام کا ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی صحیح مسلمان خاندان تھا۔ چنانچہ کچھ تو اس خاندان کے ساتھ روابط اور کچھ کتابیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے ذہن پر پڑے ہوئے پردے سرکنا شروع ہو گئے۔ یہ ذات پات اور پیشوں کے لحاظ سے انسانوں کا استحصال' آواگون' قدم قدم پر شگون اور جنتر منتر وغیرہ' یہ تمام باتیں اب اس کے لئے مزید ذہنی اذیت کا باعث بن رہی تھیں۔ رام کے لئے اب اس کے مسلمان دوست کے خاندان کی حیثیت ایسے ہی تھی جیسے حد نظر تک پھیلے' تپتے ہوئے صحرا میں ایک چھوٹا سا نخلستان' بیشک سری لنکا میں لاکھوں کی تعداد میں مسلمان رہتے تھے لیکن وہ رام کے لئے اجنبی تھے۔ وہ ویسے بھی معاشرے میں' یعنی سری لنکا کے معاشرے میں' دین اسلام کا عملی نمونہ پیش نہیں کر سکتے تھے انہی دنوں دنیائے اسلام میں پاکستان کا بہت چرچا تھا۔ موجودہ دور میں نظریات کی بنا پر قائم ہونے والی پہلی ریاست (دوسری ریاست اسرائیل ہے) دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک'

(اس وقت بنگلہ دیش کا کوئی وجود نہیں تھا) عسکری لحاظ سے مضبوط اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے اسلام کا قلعہ کہا جاتا تھا رام کو جب یہ تمام باتیں معلوم ہوئیں تو کچھ تو جوانی کے عزائم' نوعمری' خوشحالی' سیاحت کا شوق اور سب سے بڑھ کر' اسلام کے ساتھ دلچسپی ان تمام باتوں نے اسے سفر پاکستان کے لئے آمادہ کر لیا' چنانچہ اس نے رخت سفر باندھا' معقول رقم ساتھ لی اور کراچی پہنچ گیا۔

کراچی پہنچنے کے چند روز بعد' رام' سنی عقیدہ سے منسلک ایک عالم دین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ صاحب اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے اور مذہبی حلقوں میں بہت احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ جب انہیں رام کے عزائم کا علم ہوا تو بہت خوش ہوئے اور انتہائی شفقت کے ساتھ پیش آئے۔ انہوں نے ایک عام مولوی کی طرح یہ نہیں کہا کہ رام کو غسل دے کر فوراً مسلمان بنا لیتے' (بہت ممکن ہے کہ رام بھی اس کے لئے آمادہ نہ ہوتا) بلکہ اس کے لئے انگریزی زبان میں زیادہ سے زیادہ اور اہم کتب مہیا کیں اور روز مرہ معلومات کی انجام دہی کے لئے مستقل طور پر ایک ترجمان کا بندوبست بھی کر دیا۔ رام بہت خوش تھا اور اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ گویا فردوس گمشدہ کے آثار ملنے شروع ہو گئے ہوں۔ ابھی اسے ان عالم دین کی صحبت سے مستفید ہوتے چند ہفتے ہی گذرے تھے کہ اچانک ایک دن ایک صاحب اسے ایک اور عالم دین کی خدمت میں لے گئے جو کہ فقہ جعفریہ سے تعلق رکھتے تھے۔

یہ نئے عالم دین بھی پہلے عالم دین کی ٹکر کے تھے۔ انہوں نے تمام حالات معلوم ہونے کے بعد رام سے یہ تو نہیں کہا کہ وہ غلط جگہ چلا گیا تھا البتہ اسے اتنا احساس ضرور دلا دیا کہ اب وہ صحیح جگہ پہنچ گیا ہے۔ یہاں رام نے دین کے لئے قربانیاں' راہ حق میں صعوبتیں برداشت کرنا اور جذبہ شہادت پر اس قدر مدلل دلائل سنے کہ بس ان ہی کا ہو کر رہ گیا اور سنی عقیدہ کے عالم دین کو فراموش کر بیٹھا۔ اس نئے ماحول میں مزید چند ہفتے گذر گئے رام کے کہنے کے مطابق ویسے تو یہ تعلیمات پراثر تھیں' لیکن ان میں اسلام کی ابتدائی کڑیاں غائب تھیں۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے بنیادوں کے اوپر ایک معلق عمارت قائم کر دی گئی ہو۔ اس دوران رام ویسے ہی پاکستانی معاشرے کو کافی حد تک سمجھ چکا تھا اور اکثر و بیشتر پاکستانی معاشرے کے متعلق کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ یہ بات یاد رہے کہ ابھی تک رام نے باقاعدہ اسلام قبول نہیں کیا اور وہ مذہباً" ہندو ہی ہے۔

رام کو پتہ تھا کہ پاکستان کا شہر لاہور' قدیم تاریخی شہر ہے۔ ثقافت اور تہذیب و تمدن کا مرکز ہے اور یہاں علمی' ادبی اور دینی مراکز کی بھی کمی نہیں۔ چنانچہ اس نے کچھ سوچ کر لاہور کے لئے روانگی کا فیصلہ کر لیا۔

رام نے غالباً تیز گام یا شاید خیبر میل کے لئے لاہور کا ٹکٹ خریدا سیٹ بک کرائی اور عازم سفر ہو گیا۔ رام چونکہ خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتا تھا' دولت کی کمی نہیں تھی اس لئے فرسٹ کلاس میں سفر کر رہا تھا۔ دوران سفر اس کی ایک ایسے شخص کے ساتھ ملاقات ہو گئی۔ جو کہ ملتان کا رہنے والا تھا۔ تجارت پیشہ و ضعدار اور خوشحال تھا۔ جب اسے پتہ چلا کہ اسلام کے ساتھ دلچسپی رام کو کشاں کشاں لاہور کی طرف لئے جا رہی ہے تو اس نے رام کو بضد مجبور کیا وہ ملتان میں کچھ دن اس کے ہاں بطور مہمان قیام کرے۔ رام اس شخص کے بے پناہ اصرار اور خلوص سے متاثر ہو کر انکار نہ کر سکا اور BREAK JOURNEY کے طور پر ملتان ریلوے اسٹیشن پر اس شخص کے ساتھ ٹرین سے اتر گیا۔ ملتان والے ان صاحب کا نام آپ مظفر صاحب سمجھ لیں۔

مظفر صاحب کی بہت وسیع کوٹھی تھی' خوشحال اور وضعدار تھے' انہوں نے رام کو مہمان خانے میں ٹھہرایا اور واقعی مہمان نوازی کا حق ادا کر دیا۔ کراچی سے رام کی روانگی کی بنیادی وجہ' دو اہم مذہبی شخصیات کے مابین نظریاتی تصادم تھا۔ ملتان میں مظفر صاحب رام کو دین اسلام کے متعلق صحیح بنیادی اور قابل فہم معلومات مہیا نہ کر سکے' ویسے بھی انہیں انگریزی پر اتنا عبور حاصل نہیں تھا اور اس پر ان کی کاروباری مصروفیات۔ اس لئے ملتان میں رام کا زیادہ وقت اکیلے ہی گھومتے پھرتے گذرا' اسے جگہ جگہ دینی مراکز' مساجد اور خانقاہیں یا مزار نظر آئے۔ ایک دن مظفر صاحب اصرار کر کے اسے کسی بزرگ کے مزار پر منعقد عرس پر لے گئے۔ مزار پر پہنچتے ہی رام کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اسے ایسے محسوس ہوا جیسے اسے' واپس اسی دنیا میں دھکیل دیا گیا ہو جہاں سے اس نے نکل بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ مناظر وہی تھے' صرف نام مختلف تھے۔

ہندو معاشرے میں مندر تھا تو یہاں مزار' وہاں سمادھی تھی تو یہاں قبر' وہاں سمادھی کے ساتھ جس کے بعد کھانے پینے کی چیزیں' پرشاد کہلاتی تھیں تو یہاں تبرک۔ وہاں بھی رنگین چادروں اور آنچلوں کے ساتھ منت مانی جاتی تھی تو یہاں بھی ایسے ہی ہوتا تھا۔ وہاں یعنی مندروں میں موسیقی کی لے پر لہک لہک کر بھجن گائے جاتے تھے تو یہاں بھی وہی سماں تھا۔ یہاں اس کو قوالیاں کہا جا رہا تھا۔ وہاں داسیوں کا ناچ ہوتا تھا تو یہاں دھمال ڈالا جا رہا تھا۔ ہندو مندروں کے باہر دیواروں اور درختوں پر رنگین کپڑوں کے ٹکڑے اور ترسول کے نشانات نصب تھے تو یہاں بھی رنگین کپڑوں کے ٹکڑے لٹکتے نظر آ رہے تھے اور ترشوں کی جگہ ٹین کے ٹکڑوں سے بنائے ہوئے پنجہ نما نشانات نظر آ رہے تھے۔ آخر فرق کہاں ہے ——— ؟ کیا ہندو مذہب میں آدھا اسلام شامل تھا یا اسلام میں آدھا ہندو مت شامل ہو گیا ہے۔ مندروں کے کنوں میں بیٹھے ہوئے غلیظ اور نیم عریاں' بھنگ اور چرس کے نشے میں بدمست مخلوق کو سادھو سنت کہا جاتا ہے تو یہاں ایسی ہی مخلوق کو ملنگ

اور اللہ کا فقیر کہا جا رہا ہے۔

آخر رام کے لبوں پر دل کی بات آ ہی گئی اور مظفر صاحب سے کہنے لگا کہ جہاں تک اس نے سنا ہے' دین اسلام میں موسیقی کا کوئی تصور نہیں ہے' بلکہ چرچ اور مندروں وغیرہ میں بھی استعمال ہونے والی موسیقی کی مسلمان علماء نے ہمیشہ مذمت کی ہے تو پھر یہ مزاروں اور مساجد کے صحن میں محفل موسیقی کیونکر منعقد ہو گئی۔ "نہیں' یہ محفل سماع ہے۔" یہ مظفر صاحب کا جواب تھا۔ اب رام کے قدم ڈگمگا گئے۔ نگار خانے' طوائف کا کوٹھا' چرچ یا مندر میں استعمال ہونے والی موسیقی تو شیطانی کام ہے' آخر یہ موسیقی روحانی کیسے بن گئی؟ ایک ایسا جانور جو کہ حرام قرار دیا جا چکا ہو' کیا تکبیر پڑھ کر ذبح کر دینے سے حلال قرار دیا جا سکتا ہے۔؟ رام کو ایک واقعہ یاد آ گیا جو کہ کراچی میں قیام کے دوران اس نے پاکستانی معاشرے کے متعلق ایک کتاب میں پڑھا تھا۔

پنجاب کے کسی گاؤں میں ایک پیر صاحب قتل ہو گئے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق' قتل کے وقت پیر صاحب شراب کے نشے میں بدمست تھے۔ عدالت میں جرح کے دوران قاتل کے وکیل نے پیر صاحب کے ایک مرید سے پوچھا' "کیا تمہیں پتہ ہے کہ تمہارا پیر شراب بھی پیا کرتا تھا۔؟" یہ سنتے ہی مرید نے کانوں کو ہاتھ لگا لگا کر واویلا کرنا شروع کر دیا۔ "توبہ کرو جی توبہ!" مرید نے کہا' "سرکار جو شراب پیتے تھے وہ ہم گنہگاروں کو کہاں نصیب! سرکار تو "ہو حق کی شراب پیتے تھے۔" یہ واقعہ یاد آتے ہی رام کی سمجھ میں یہ فلسفہ آ گیا' یعنی جیسی ہو حق کی شراب ویسی ہی ہو حق کی موسیقی۔ رام کے قریب ہی کھڑے مظفر صاحب کہہ رہے تھے۔ "یہ صوفیانہ کلام ہے' ہم گنہگار اسے کہاں سمجھ سکتے ہیں۔" رام ہندو تھا مظفر صاحب کو یہ نہ کہہ سکا کہ قرآن پاک کا نزول بھی تو گنہگاروں ہی کے لئے ہوا تھا۔ انبیاء کرام یا فرشتوں کے لئے تو نہیں ہوا تھا۔ پھر یہ صوفی ازم کیا ہے۔ کیا یہ اسلامی تصور ہے جس نے مجاہد کے ہاتھ سے تلوار چھین کر تسبیح پکڑا دی تھی اور کہا تھا کہ حجرے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرتے رہو' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یعنی جذبہ شہادت ختم کر کے رہبانیت کی طرف مائل کر دیا تھا۔

"پوری کائنات میں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی غلطی سے مبرا ہے۔ انسانوں میں صرف انبیائے کرام ہی معصوم ہیں۔ لیکن بحیثیت انسان نبیوں سے بھی بسا اوقات غلط فیصلے سرزد ہوتے رہے ہیں۔ لیکن انبیائے کرام کو ایک فوقیت حاصل تھی اور وہ تھی۔ خدا تعالیٰ کے ساتھ وحی کے ذریعے رابطہ۔ جونہی کسی نبی سے کوئی غلط فیصلہ ہوتا تو ذات باری تعالیٰ وحی کے ذریعے فوراً ہی اس کی تصحیح کر دیتی تھی۔ نبوت ختم ہو گئی' وحی کا سلسلہ بند ہو گیا' اب ہدایت حاصل کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے —— قرآن۔ کوئی بھی تعلیم جو قرآن کی تعلیمات کے منافی ہو' غلط ہے۔ ایسی

تعلیم دینے والا عالم دین ہے یا بزرگ یا کچھ اور' بحیثیت انسان غلطی کر سکتا ہے۔ لیکن ——— قرآن کی تعلیم غلط نہیں ہو سکتی۔

آج ہم جن کو بزرگان دین سمجھ رہے ہیں وہ اپنے وقت کے علماء کرام تھے۔ بدقسمتی سے جب خلافت' ملوکیت میں تبدیل ہوئی تو کیا اس وقت کے چوٹی کے علماء نے اس کی تائید نہیں کی تھی۔؟ بیشک ملوکیت میں اچھے حاکم بھی تھے اور ظالم و جابر بھی' اس کے باوجود اسلام میں ملوکیت کا کوئی تصور نہیں ہے ایک طرف تو علماء کرام درسگاہوں میں بیٹھ کر اپنے شاگردوں کو ——— جابر حاکم کے سامنے کلمہ حق کہنا سب سے بڑا جہاد ہے ——— کی تعلیم دیتے رہے اور پھر یہی علماء کرام منبر مسجد پر بیٹھ کر اسی جابر حاکم کے نام کا خطبہ پڑھتے رہے۔

فتنہ ملتِ بیضا ہے امامت اس کی جو مسلماں کو سلاطین کا پرستار کرے

مغل شہنشاہ' اکبر اعظم نے محض ہندوؤں کی خوشنودی کی خاطر دین الٰہی کی بنیاد رکھی۔ دین الٰہی یا دین اکبری کیا تھا' محض چوں چوں کا مربہ۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت کے کئی چوٹی کے علماء نے دین اکبری کی حمایت کی تھی اور اسے درست قرار دیا تھا۔ زیادہ دور مت جایئے۔ تحریک پاکستان جو کہ صحیح اسلامی نظریاتی تحریک تھی۔ اس تحریک کی بھی ہندوستان کے کئی چوٹی کے مسلمان علماء نے محض پنڈت نہرو' پٹیل اور گاندھی وغیرہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر مخالفت کی تھی۔ پاکستان میں بھٹو صاحب نے جب اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگایا تو پاکستان کے کئی علماء حمایت اور مخالفت کے طور پر تقسیم ہو گئے تھے۔ ابھی تو ان اخبارات کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی جن میں خبر کے ساتھ باقاعدہ تصاویر بھی چھپی ہیں کہ پاکستان کے چوٹی کے پیروں اور علماء کرام کا ایک گروہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ ہاتھ اٹھائے' انتخابات میں کامیابی کے لئے دعائیں مانگ رہا ہے تو دوسرا گروہ اسی بے نظیر کے خلاف فتوے دے رہا ہے۔ بحث یہ نہیں کہ ان میں صحیح کون ہے اور غلط کون؟ یقیناً ایک گروہ غلطی پر ہے' اور غلط گروہ سے متعلق بڑے بڑے پیر اور علماء کرام اپنے ساتھ لاکھوں کی تعداد میں اپنے مریدوں اور نیاز مندوں کو بھی تباہی کے اندھیرے غار کی طرف لے جا رہے ہیں۔ اور یہ کوئی بڑی بات بھی نہیں۔ تباہی واقعی ہمارا مقدر بن چکی ہے۔ آدھا ملک تو ہم گنوا ہی چکے ہیں۔ آج کے یہی علماء کرام اور پہنچے ہوئے پیر آنے والے کل کو بزرگ گردانے جائیں گے اور چاروں طرف ان کے معجزات اور کرامات کے چرچے ہوں گے۔

راسپوٹین سے کون واقف نہیں۔ روس کے آخری زار کے زمانے میں اسے روس کے اعلیٰ حلقوں میں بے پناہ اہمیت حاصل تھی' کوئی اسے راہب سمجھتا تھا تو کوئی اسے سینٹ اور ولی قرار دیتا تھا۔ وہ بیمار بچوں کے جسم پر ہاتھ پھیرتا تھا تو بچے تندرست ہو جاتے تھے۔ لوگ ہزاروں میل کا سفر

طے کر کے اس کے پاس دعا کے لئے آتے تھے۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ کشش کی وجہ سے ہر کسی کے بس کا روگ نہیں تھا کہ اس کے ساتھ آنکھ ملا کر بات بھی کر سکے۔ (یہ کشش محض مسمریزم اور ہپناٹزم میں مشق کی وجہ سے تھی' روحانیت کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں) زار اور زارینہ تک رسائی کے لئے اس کی سفارش غیر معمولی اہمیت حاصل کر چکی تھی' لیکن دوسری طرف اس کی اخلاق باختگی کی یہ حالت تھی کہ دس آدمیوں کے جمعے کی شراب وہ اکیلا ہی ہضم کر جاتا تھا۔ اعلیٰ سوسائٹی کی شاید ہی کوئی ایسی خوبصورت عورت ہو جو اس کی ہوس کا نشانہ نہ بن چکی ہو۔ جب راسپوٹین قتل ہوا تو اس وقت بھی وہ پاکستان کے پیر صاحب کی طرح شراب کے نشے میں بدمست تھا۔ اگر روس میں کمیونسٹ انقلاب نہ آتا اور زار ہی کی حکومت برقرار رہتی تو یقیناً آج روس میں دوسرے (SAINTS) کی طرح سینٹ راسپوٹین کے نام کا بھی مزار ہوتا' جہاں لوگ چڑھاوے چڑھا رہے ہوتے۔ خدا جانے پاکستان میں ایسے کتنے راسپوٹین موجود ہیں۔

معافی چاہتا ہوں! بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ہاں تو ذکر ہو رہا تھا رام کا۔ رام نے ملتان میں جو کچھ دیکھا وہ اسے کوئی نئی راہ تو نہ دکھا سکا البتہ اسے ماضی کی طرف زیادہ دھکیل دیا۔ مظفر صاحب اپنے کاروبار میں مصروف رہتے تھے اس لئے رام' ملتان میں کسی سنجیدہ مذہبی طبقے تک رسائی حاصل نہ کر سکا اور نہ ہی اس نے اس مقصد کے لئے سنجیدگی کے ساتھ کوشش کی' اور پھر ایک دن وہ مظفر صاحب کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کر کے لاہور کے لئے روانہ ہو گیا۔

جس وقت رام لاہور پہنچا' اس وقت پاکستان کے اندرونی حالات سخت مخدوش تھے۔ لاہور مکمل طور پر جوالا مکھی بنا ہوا تھا۔ مرحوم ایوب خاں کے خلاف تحریک عروج پر تھی۔ ہر طرف توڑ پھوڑ' جلاؤ گھیراؤ' پتھراؤ' آوے ای آوے' جاوے ای جاوے' پہیہ جام اور 'ہے جمالو' قسم کے نعروں سے پورا شہر گونج رہا تھا۔ ہر سیاسی جماعت کے ورکر توڑ پھوڑ میں اس طرح حصہ لے رہے تھے جیسے پاکستان ان کا اپنا ملک نہیں بلکہ دشمن کا مفتوحہ علاقہ ہو اور اب وہ صدیوں پرانی دشمنی کا بدلہ چکانے کے لئے دل کی بھڑاس نکال رہے ہوں۔ ایسے حالات میں یہاں ایک غیر ملکی کے لئے قیام کرنا خطرناک ہو سکتا تھا' لیکن نہ جانے وہ کون سا جذبہ تھا جو رام کو یہاں ٹھہرنے پر آمادہ کر رہا تھا۔

لاہور میں سب سے پہلے رام نے ایک ایسی مذہبی جماعت کے در دولت پر حاضری دی جو مذہب کے علاوہ ملکی سیاست پر بھی گہرے اثرات رکھتی تھی۔ جماعت کے امیر تو ملکی حالات کی وجہ سے بہت مصروف اور اکثر دوروں پر رہتے تھے لیکن جماعت کے دوسرے اکابرین نے رام کا خاص خیال رکھا اور جہاں تک ممکن ہوا دینی معاملات میں راہنمائی کرتے رہے۔ لیکن مسئلہ وہیں تھا کہ

رام نے کراچی یا ملتان میں جو کچھ سیکھا یا دیکھا تھا' ان نظریات کے ساتھ جب یہاں تصادم کی بات ہوتی تو وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ' ان میں درست کون ہے' اور غلط کون۔؟

لاہور میں بھی رام کا کراچی والا حشر ہوا۔ یہاں بھی وہ مختلف مکاتب فکر سے ملا لیکن مسئلہ جوں کا توں رہا۔ مختلف مکاتب فکر کے مابین نظریاتی تضاد تو ایک طرف جب وہ یہاں کے معاشرے' جسے کہ اسلامی معاشرہ کہا جاتا تھا' میں اسلامی قوانین کا عملی نفاذ' دیکھتا تو پھر اور بھی الجھ کر رہ جاتا اسے تو ہر طرف اپنا ہی ہندو معاشرہ نظر آ رہا تھا' بلکہ مذہب کے نام پر کچھ رسومات تو ایسی بھی دیکھیں جو خود ہندو معاشرے میں بھی قابل نفرت ہیں۔ مثلاً ایک دن' ایک صاحب اسے بڑے خلوص کے ساتھ' رسم عقیقہ کی ایک تقریب میں لے گئے۔ رام کو بتایا گیا کہ رسم عقیقہ دراصل سنت رسولؐ ہے' جس میں جانور کی قربانی اور صدقہ خیرات دیا جاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ بچے کی درازی عمر اور صحت کے لئے کیا جاتا ہے۔ ایک بہت بڑی کوٹھی کے لان میں تقریب منائی جا رہی تھی۔ رام کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ ایک مذہبی رسم کی ادائیگی ہے یا کوئی جشن ہر طرف رنگ و بو کا طوفان تھا اور اس طوفان میں ہر کوئی ایک دوسرے سے بڑھ کر اپنی امارت کے مظاہرے کر رہا تھا۔ شام کے بعد یہ تقریب اس وقت اپنے عروج پر پہنچی جب مہمانوں کی تفریح طبع کے لئے طوائفوں کے رقص کا اعلان کیا گیا۔ پہلے تو رام کو اس بات کا یقین ہی نہ آیا لیکن جب اس نے خود اپنی آنکھوں سے طوائفوں کو رقص کی تیاری میں محو دیکھا تو وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ صاحب خانہ نے طوائفوں کو اپنی کوٹھی پر مدعو کر کے کوٹھے اور کوٹھی کے مابین شرافت کے فاصلے پر خود ہی لکیر پھیر دی ہے دوسری بات وہ یہ سوچ رہا تھا کہ عقیقے کو تو سنت رسولؐ کہا گیا تھا' کیا پاکستان کے مسلمان طوائفوں کے مجرے کے بغیر سنت رسولؐ بھی ادا نہیں کر سکتے۔ کیا سنت رسولؐ کی ادائیگی کا یہی طریقہ ہے۔؟ نہیں! نہیں ایسے نہیں ہو سکتا ان ہی خیالات کی الجھن میں رام نے صاحب خانہ سے رسمی اجازت کی زحمت بھی گوارہ نہ کی اور چپکے سے محفل سے نکل گیا۔

ایسے ہی حالات میں مزید چند ہفتے گذر گئے۔ ابھی تک رام کو کوئی ایسا ٹھکانہ میسر نہ آ سکا جہاں وہ تضاد سے مبرا' اسلامی تعلیمات کا یکسوئی اور قابل فہم انداز میں مطالعہ کر سکتا۔ کچھ دنوں کے بعد فضا میں ارتعاش سا محسوس ہوا۔ پتہ چلا کہ محرم الحرام کا مہینہ شروع ہو گیا ہے۔ رام کو بھی چند ایک مجالس میں جانے کا اتفاق ہوا اور نواسہ رسولؐ کے ساتھ مسلمانوں کی عقیدت کی انتہا دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ چند دنوں کے بعد ذوالجناح کا جلوس دیکھا تو ایک دفعہ پھر اس کے خیالات پلٹا کھا گئے۔

ایوب خاں مرحوم کے خلاف تحریک اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ لاہور کے شہریوں کے

اعصاب پر ہر وقت ایک تناؤ کی کیفیت طاری رہتی۔ شہر کے قریباً ہر کیفے ٹیریا اور ریسٹورنٹ میں سرشام ہی محفلیں جم جاتیں اور ملکی مسائل پر بحث و مباحثے ہوتے اور بسا اوقات نوبت گالی گلوچ تک بھی پہنچ جاتی۔ لاہور کے مشہور ترین بازار' انارکلی کے باہر ایسے ہی ایک ریسٹورنٹ میں ایک کمیونسٹ نے اپنا ڈیرہ جمایا ہوا تھا۔ شام ہوتے ہی یہ کمیونسٹ اپنے یاران قدح خوار کے ساتھ وہاں پہنچ جاتا اور رات گئے تک وہ اور اس کے ساتھی شامی کباب' سموسے اور پیسٹریز کی کئی پلیٹیں خالی کرتے ہوئے' غریب کسانوں اور مزدوروں کی بھوک اور افلاس سے پُر حالت زار پر آنسو بہاتے رہتے۔ اسے اتفاق ہی سمجھئے کہ ایک دن رام بھی اسی ریسٹورنٹ میں پہنچ گیا اور یہاں اس کی اس پاکستانی کمیونسٹ کے ساتھ علیک سلیک ہو گئی۔

کمیونسٹ کو جب پتہ چلا کہ رام غیر ملکی ہے' اور اردو زبان سے بھی نابلد' تو اس کا رویہ کافی محتاط ہو گیا۔ شاید ملکی حالات کا بھی یہی تقاضا تھا۔ اس کے باوجود چند ہی دنوں میں رام اس پاکستانی کمیونسٹ کے ساتھ کافی گھل مل گیا اور پھر------ ایک دن رام نے انتہائی جذباتی عالم میں پاکستان میں اپنی آمد کا مقصد اور دیگر تمام حالات سے اس پاکستانی کمیونسٹ کو آگاہ کر دیا۔ انتہائی گلوگیر لہجہ میں رام نے بتایا کہ اس نے سنی' وہابی' شیعہ' بریلوی' دیوبندی' نقشبندی اور نہ جانے کون کون سے مکاتب فکر سے ملاقات کی ہے اور ابھی تک وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ ان میں صحیح راستے پر کون اور غلط راستے پر کون ہے۔؟

خدا جانے اس کمیونسٹ کے دل میں کیا خیال آیا کہ اس نے انتہائی شفقت کے ساتھ رام کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا' "رام بھائی! تمہاری نجات کا ایک ہی راستہ ہے۔" "وہ کیا" رام نے انتہائی اشتیاق سے پوچھا۔ "نجات کا راستہ یہ ہے۔" کمیونسٹ نے کہا۔ "اگر تمہارے پاس ابھی تک سری لنکا کا واپسی ٹکٹ ہے تو کل صبح پہلی فلائٹ سے کولمبو کے لئے سیٹ بک کرا لو اور واپس چلے جاؤ۔" کمیونسٹ نے مزید کہا۔ "اس سے زیادہ مخلص مشورہ پورے پاکستان میں تمہیں کوئی بھی نہیں دے سکتا۔" دوسرے دن PIA کے دفتر میں رام اپنی سیٹ بک کرا رہا تھا۔ سیٹ بک ہونے میں چند دن لگ گئے۔ اس دوران میں اسے صرف دو مرتبہ مل سکا۔ وہ بہت پریشان اور الجھا ہوا تھا لیکن اس کے باوجود اس نے شائستگی کو برقرار رکھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے مذہب کے موضوع پر قطعاً کوئی بات نہیں کی۔ اگر کوئی دوسرا یہ موضوع چھیڑ بھی دیتا تو رام خوبصورتی سے بات ٹال دیتا۔ ایسے محسوس ہوتا تھا کہ اس نے کوئی مصمم ارادہ کر لیا ہے۔

رام واپس سیلون چلا گیا اور میں یہ سوچتا رہ گیا کہ ----- رام کی پاکستان میں سنی' شیعہ' وہابی' بریلوی' دیوبندی' نقشبندی اور نہ جانے کس کس "گروہ بندی" سے ملاقات ہوئی۔ اسے یہ سب

لوگ بڑے تپاک اور بظاہر خلوص سے ملے' لیکن کاش! ---- ایسے مسلمان بھی ملے ہوتے' ایسے مسلمان جن کی مثال ہم مسلمانوں کی اس جماعت سے دے سکتے جو کہ صرف اور صرف تین سو تیرہ (313) افراد پر مشتمل تھی۔

خطہ عرب کے تپتے ہوئے صحراؤں میں مقام بدر پر یہ مختصر سی جماعت اپنی بقاء کے تحفظ کی خاطر ایک غرق آہن لشکر جرار کے سامنے مقابلے کے لئے صف آراء ہے۔ مسلمانوں کی عسکری قوت کا یہ عالم ہے کہ مجاہدین کے پاس صرف دو عدد گھوڑے ہیں۔ سب کے پاس مکمل ہتھیار بھی نہیں۔ اگر کسی کو اور کچھ نہیں ملا تو اونٹ کی لمبی سی ہڈی کو ہی ہتھیار کی صورت میں تبدیل کر کے لے آیا ہے۔ ان تمام حالات کے باوجود ان میں اخوت اور اتحاد کے جذبے کی کمی نہیں ہے۔ ان میں نہ تو کوئی وہابی ہے۔ نہ سنی' نہ شیعہ ہے نہ بریلوی نہ دیو بندی ہے نہ نقشبندی۔ یہ صرف اور صرف مومنین کی جماعت ہے جس نے اپنے آپ کو خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کے لئے وقف کر دیا ہے۔ اطاعت کے ساتھ عقیدت بھی ایسی کہ اس کے سامنے تمام دنیاوی رشتے ماند پڑ گئے ہیں۔ نسل ایک ہے' آباؤ اجداد مشترک ہیں' رسم و رواج رہن سہن' طرز معاشرت' ہر چیز مشترک ہے' لیکن ---- لیکن خدا کی وحدنیت اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کے فرق نے انہیں مقام بدر پر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی کم فہم یہ کہے کہ یہ کیسا اسلام ہے۔ جس نے بھائی کو بھائی کے خلاف اور رشتے دار کو رشتے دار کے خلاف صف آراء کر دیا ہے۔ ایسی بات کہنے والا یہ نہیں جانتا کہ جب حقیقی رشتے قائم ہوتے ہیں تو دنیاوی رشتے ثانوی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ ایک طرف حضرت ابو بکرؓ ہیں تو دوسری طرف ان کا بیٹا ہے۔ ایک طرف حضرت عمرؓ ہیں تو دوسری طرف ان کا ماموں (ابو جہل) ہے۔ ایک طرف حضرت علیؓ ہیں تو دوسری طرف ان کا بھائی عقیل ہے۔ اور سب سے بڑھ کر' ایک طرف بذات خود سرور کائناتؐ ہیں تو دوسری طرف ان کے حقیقی چچا (حضرت) عباس اور داماد ابو العاص ہیں۔

یہ تو تھے دنیاوی یا خونی رشتے' جو کہ محض اس لئے بکھر کر رہ گئے کہ ان میں قرآن مشترک نہیں تھا' خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت مشترک نہیں تھی ---- لیکن حضرت بلالؓ حبشی کون تھے؟ وہ تو ان میں سے کسی کے بھی رشتے دار نہیں تھے اور نہ ہی ان کا اس معاشرے کے ساتھ بنیادی تعلق تھا۔ اس کے باوجود وہ جماعت مومنین کے ایک اہم رکن تھے اور ان کا اس جماعت کے ساتھ حقیقی رشتہ تھا' دنیاوی نہیں۔ یہی ہے دو قومی نظریے کی بنیادی اکائی' یعنی کفار اور مومنین کے مابین بنیادی فرق۔ تین سو تیرہ (313) افراد پر مشتمل مومنین کی یہی وہ جماعت ہے جو کہ مقام بدر پر اپنی بقاء کی خاطر غرق آہن لشکر جرار کے خلاف بے سروسامانی کے عالم میں صف آراء ہے اور سرور کائنات' بارگاہ' ایزدی

میں ہاتھ اٹھائے بے اختیار دعا مانگ رہے ہیں:

"یا پروردگار! اگر آج یہ مختصر سی جماعت مٹ گئی تو پھر قیامت تک تیری عبودیت اختیار کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔"

قرآنی تعلیم کے مطابق فرقہ بندی کفر ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ہمارے علماء کرام جو کہ بات بات پر کفر کے فتوے صادر کرتے رہتے ہیں۔ کیا ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ نظریات میں فرق کی بنیاد پر الگ الگ فرقے بنا کر بذات خود کفر کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ کیا انہوں نے کبھی قرآن پاک کی ان آیات پر بھی غور کرنے کی زحمت گوارہ کی ہے۔

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا (3/103)

تم سب کے سب مل کر اس ضابطہ خداوندی (قرآن) کو مضبوطی سے تھامے رہو اور فرقوں میں مت بٹ جاؤ۔

اس سے آگے چلئے۔

ولا تکونوا من المشرکین (30-31)

دیکھو کہیں تم توحید پر ایمان لانے کے بعد پھر مشرک نہ بن جانا۔ یعنی

من الذین فرقوا دینھم و کانوا شیعا

ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈال دیا اور فرقے بن گئے۔

اور پھر سب سے بڑھ کر یہ حکم خداوندی کہ

ان الذین فرقوا دینھم و کانوا شیعا لست منھم فی شیء (6-160)

جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیں اور الگ فرقہ بن کر بیٹھ جائیں۔ اے رسولؐ تیرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

ذرا غور کیجئے! اس حالت میں پہنچ کر، جہاں تک کہ خدا اور اسکے رسولؐ کے ساتھ تعلق یعنی نسبت ہی منقطع ہو جائے وہاں ہم کس منہ سے یہ دعا مانگ سکتے ہیں کہ ---

"اے خداوند کریم! اپنے حبیبؐ کے صدقے ---------"

خداوند کریم کے حبیبؐ یعنی سرور کائنات کی امت واحدہ کو تو ہم نے بھان متی کا کنبہ بنا کر رکھ دیا ہے یعنی اس کے ٹکڑے کر ڈالے ہیں پھر اب کس منہ سے ان ہی کی ذات کا واسطہ دے کر خداوند کریم سے اس کی رحمت کے لئے دست بدعا ہیں۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ کوئی بدبخت پہلے تو اپنے والدین کو قتل کر دے اور پھر قید و بند کی صعوبتوں سے گھبرا کر اس بنیاد پر سربراہ مملکت کی خدمت میں درخواست بھیجے کہ ——

وہ چونکہ یتیم ہے اس لئے اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا جائے۔

یہ ہے ہماری بدبختی کہ پہلے تو ہم نے جماعت مومنین یعنی امت واحدہ کے ٹکڑے کر ڈالے یعنی فرقے بنا لئے اور اس نااتفاقی کے نتیجے کے طور پر' اس وقت جب کہ تباہی ہمارے سر پر کھڑی ہے۔ (دنیا میں آج آخر کون سا ایسا اسلامی ملک ہے جس کی پوزیشن مستحکم ہو اور وہاں کے مسلمان سکھ کا سانس لے رہے ہوں) تو ہم بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہیں کہ "اے پروردگار! ہم چونکہ تباہی کے دہانے تک پہنچ چکے ہیں اس لئے اپنے حبیبؐ کے صدقے ہم پر کرم فرما۔"

سب سے بڑھ کر بدبختی یہ ہے کہ ایسی تباہی کے عالم میں بھی بارگاہ ایزدی میں ہمارے ہاتھ مشترکہ طور پر نہیں اٹھ رہے۔ فرقہ بندی کا اختلاف یہاں بھی نمایاں ہے۔ انگریزی کی ایک کہاوت ہے:

COMNON CLAMITY CREATS THE UNITY

لیکن شاید یہ کہاوت مسلمانوں کے لئے نہیں بنی۔ ایسے واقعات بھی سننے میں آئے ہیں کہ مسلمانوں کے کسی علاقے میں سالہا سال تک بارش نہیں ہوئی۔ کنویں خشک اور زمینیں بنجر ہو گئی ہیں۔ درختوں پر ہریالی کا پتا تک نظر نہیں آ رہا۔ جانور تو بھوک اور پیاس سے مر ہی چکے ہیں۔ اب انسانوں کی باری بھی آ رہی ہے۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے دودھ کے چند قطروں کے لئے ترس رہے ہیں۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی ہے۔ ان حالات میں عمائدین فیصلہ کرتے ہیں کہ اب جبکہ تمام انسانی کاوشیں لاحاصل ثابت ہو چکی ہیں۔ اس عفریت سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے کہ تمام مسلمان مل کر بارگاہ ایزدی میں گڑگڑا کر دعا کریں۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے نماز استسقاء کا اعلان کیا جاتا ہے۔ قرب و جوار سے تمام مسلمان ایک میدان میں جمع ہو جاتے ہیں۔ صفیں درست کی جاتی ہیں' اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نماز کی امامت کون کرے گا؟ ہر فرقے کی خواہش ہے کہ صرف اسی کا ——— عالم دین ——— امامت کرے۔ کسی اور کی امامت میں نماز کی ادائیگی کو وہ جائز نہیں سمجھتے۔ بات بڑھ جاتی ہے۔ پہلے تو تو مَیں مَیں اور اس کے بعد ہاتھا پائی اور پھر ہتھیار نکل آتے ہیں۔ ——— اس کے بعد بارش ہوتی ہے اور موسلا دھار ہوتی ہے۔ لیکن یہ خون کی بارش ہوتی ہے۔ بارش کے دیوتا کے حضور انسانی خون کا نذرانہ چڑھاوا دیا جاتا ہے۔ اور پھر ہر فرقے کے لوگ اپنے اپنے "شہیدوں" کو فخر کے ساتھ دفن کر دیتے ہیں۔

ہمارا خدا ایک ہے۔ رسولؐ ایک ہے۔ کعبہ ایک ہے۔ قرآن ایک ہے پھر یہ الگ الگ فرقے اور فرقوں کے نام پر الگ الگ مسجدیں کیوں۔؟ اپنے آپ کو صرف ایک ہی مسجد کے ساتھ وابستہ کر لینا بھی فرقہ بندی کے رجحان کی غمازی ہے۔ (ایک ہی مسجد سے مراد مخصوص فرقے کی مساجد)

جس دن یہ رجحان یعنی فرقہ بندی کا رجحان ختم ہو گیا۔ اس دن کے بعد سے نہ تو سر پھٹول ہو گی اور نہ ہی فرقہ وارانہ فسادات ہوں گے اور نہ ہی کوئی رام امت اسلامیہ کی طرف سے دل برداشتہ ہو کر ناکام واپس جائے گا۔

ملک حنیف وجدآنی

سابق روس کی آزاد مسلم ریاستیں

مولانا محمد جنید صاحب آف (مغل) جہلم تاشقند ازبکستان کا دورہ کر کے (۳ جنوری تا ۱۸ جنوری ۹۳ء) واپس آئے۔ میری اتفاقیہ ملاقات میں اُن کے انٹرویو کا خلاصہ ملاحظہ ہو۔ (یہ بلا تبصرہ ہے)۔

- وہاں بہت زیادہ صفائی کا خیال رکھا جاتا ہے اور عملاً اس پر کام ہو رہا ہے۔ ہم صفائی کے اس معیار سے بہت پیچھے ہیں
- فروٹ کی بہتات ہے۔ ایک روپیہ فی کلو انگور اور ۲۵ روپیہ فی کلو سیب ملتا ہے۔ انگور کی ۶۰۰ اقسام ہیں۔
- روسیوں کے مکان خالی پڑے ہیں۔ ۲۰۰ روپے فی جریب زمین مل جاتی ہے۔
- اُردو ۲ فیصد، فارسی ۰، فیصد، ازبک ۲۵ فیصد اور کچھ ترکی بھی بولی جاتی ہے۔
- ہم نے ۱۵ مساجد دیکھیں جن میں سے صرف ۳ مساجد میں امام تھے اور وہاں باجماعت نماز کا اہتمام تھا۔ سعودی حکومت کے تقریباً ۳۰ دارالعلوم، کویت کے ۲۵ طالبات کی تعلیم کا انتظام کر رہے ہیں۔ حکمت یار گروپ، مودودی لٹریچر فراہم کر رہا ہے، ان کے برعکس پاکستان وہاں بمنزلہ صفر ہے۔ علامہ اقبالؒ کے عقیدتمند وہاں موجود ہیں۔
- عورتیں ٹخنوں تک پاجامہ پہنتی ہیں اور بے نظیر کو پسند کرتی ہیں۔
- روسی زبان والا قرآن مل جاتا ہے، جو عربی تمن والا نہیں، وہاں قرآن مترجم کی ضرورت زیادہ ہے۔
- ایک مخصوص طبقہ وہاں مؤثر بن چکا ہے۔ جنازے کے بعد دعا نہیں کرنے دیتے۔ قبر پر قرآن شریف نہیں پڑھنے دیتے۔ نذرانے، سلام اور زیارت سے منع کیا جاتا ہے۔
- مہمانوں کو ڈیکا شراب پیش کی جاتی ہے۔
- اللہؒ، محمدؐ اور مکہ کا پورا احترام کیا جا رہا ہے۔
- چمڑے کی جیکٹ بہت مہنگی ہے۔
- اولمپیا ہوٹل میں ۱۵ روپے یومیہ پر جگہ مل جاتی ہے۔ ویزا ۱۵ دن کا ملتا ہے۔
- حضرات علماء و مشائخ کا احترام کیا جاتا ہے۔

اِک شمع اور بجھی

کراچی سے اطلاع ملی ہے کہ ڈاکٹر احمد شیخ صاحب پچھلے دنوں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ پرویزؒ صاحب اپنی آخری بیماری کے دنوں میں جب ہسپتال سے گھر آئے تو جن لوگوں کو انہوں نے بے تابی سے یاد کیا ان میں ڈاکٹر احمد صاحب بھی تھے۔

ڈاکٹر صاحب ایک تجربہ کار ماہر ہومیوپیتھ تھے، طارق روڈ کراچی کی ایک ذیلی سڑک پر ان کا مطب تھا، مصروف آدمی تھے مگر پرویزؒ صاحب نے یاد کیا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے آ گئے اور ایک دن، دو دن نہیں، ہفتہ دس دن نہیں پورا ایک ڈیڑھ ماہ یہیں رہے، سارا وقت پرویزؒ صاحب کے ساتھ۔

ایک آدھ بار انہیں مشورے کی ضرورت محسوس ہوئی، مشورے کی نوعیت بھی کچھ اس قسم کی تھی کہ ہومیوپیتھ ہی اس کا مداوا کر سکتا تھا، انہوں نے دوا کا نام دیا، دوا منگوائی اور اس نے تیر بہدف کا کام کیا۔

پرویزؒ صاحب بہتر ہوئے تو انہیں وہیل چیئر پہ ہوا خوری کے لئے باغِ جناح لے گئے، ان کی تصویریں بنائیں ـــــ ڈاکٹر صاحب ایک ماہر فوٹو گرافر بھی تھے، بڑی بڑی خوبصورت تصویریں ان کے البموں میں ملیں گی، انسانوں کی، پھولوں کی، پرندوں کی، جگہوں کی ـــــ

وہ پرویزؒ صاحب کے ان احباب میں سے تھے جو ان کو 'چوہدری صاحب' کہہ کر مخاطب کرتے تھے، ظاہر ہے کہ یہ مقام بے تکلف دوستوں ہی کو حاصل ہو سکتا ہے۔ کلکتہ کے ہومیو کالج سے فارغ التحصیل تھے،

علم دوست، گہری قرآنی فکر کے حامل تھے، کراچی میں ان کا میل جول بس چند علم دوست حضرات سے ہی رہا، مشہور قانون دان اور دانشور جناب خالد اسحاق سے خاص رابطہ تھا، طلوعِ اسلام آخر تک زیرِ مطالعہ رہا، اگر کبھی پرچہ نہ ملتا تو گلہ رہتا۔ بیماری کے متعلق کوئی خاص خبر نہ ملی، بس یہی کہنا چاہیئے، بلاوا آ گیا، سرِ تسلیم خم کر دیا اور خالقِ حقیقی کے دربار میں حاضر ہو گئے۔

پرویزؒ صاحب کے اس پرانے ساتھی کی وفات اک شمعِ قرآنی کا بجھنا اور دوست احباب (اور ان سے مستفیض ہونے والے مریضوں) کے لئے محرومی کا باعث ہے ـــــ پرانے بادہ خوار تھے جتنے سب اٹھتے جاتے ہیں ـــــ دعا ہے کہ اللہ مغفرت کرے حیاتِ آخروی میں انہیں بلند درجات ملیں ـــــ آمین۔

بچوں کا صفحہ

اسلامی معاشرت
علامہ غلام احمد پرویزؒ

تعلیم

(۱۲)

علم انسان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اسے علم دیا گیا ہے۔

عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔ (۲/۳۱)

"خدا نے آدم کو تمام اشیاء کا علم دے دیا۔"

زبانی علم، زبانی باتوں سے بھی سکھایا جاتا ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝ (۵۵/۳-۴)

"خدا نے انسان کو پیدا کیا اور اسے باتیں کرنا سکھایا۔"

تحریری اور تحریر کے ذریعے بھی۔

عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (۹۶/۵)

"اس نے انسان کو لکھنا سکھایا اور ان چیزوں کا علم دیا جن سے وہ واقف نہیں تھا۔"

بے علم علم والا اور بے علم کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۳۹/۹)

"ان سے پوچھو کہ کیا علم رکھنے والے اور بے علم دونوں ایک جیسے ہو سکتے ہیں۔"

م کی کوئی حد نہیں

علم کی کوئی حد نہیں۔ اس لئے

ی وقت بھی یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ
ں نے ہرایک علم کو ختم کرلیا ہے، اب
جھے کچھ حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔
میشہ علم کی تلاش میں رہنا چاہیئے اس
لئے کہ

فَوْقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ٥
(۱۲/۷۶)

"ہر علم والے کے اوپر کوئی نہ کوئی اور
علم والا ہوتا ہے۔"

لیکن دنیا میں جتنے بھی علم ہیں وہ سب انسانی عقل کے پیدا کردہ ہیں اور انسانی عقل غلطی کر سکتی ہے۔ ان تمام علموں کے اوپر

وحی کا علم

خدا کا علم ہے جو کبھی غلطی نہیں کرتا۔ خدا کا یہ علم وحی کے ذریعے رسولوں کو ملتا ہے۔ ہمارے رسولِ کریم کو جو علم خدا کی طرف سے ملا تھا وہ قرآن شریف کے اندر ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم میں کوئی غلطی نہیں اور اس میں جو کچھ لکھا ہے بالکل یقینی ہے۔ انسان کا کوئی علم اس تک نہیں پہنچ سکتا۔

ریکارڈ شدہ کیسٹس بحساب ۱۶۰/- روپے فی کیسٹ طلوعِ اسلام ٹرسٹ ۲۵ بی گلبرگ ۲ سے دستیاب ہیں۔ پیکنگ ڈاک خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔ کیسٹس بذریعہ VP ارسال نہیں کئے جاتے۔

فہرست وڈیو کیسٹس مشتمل بر دروسِ قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ و خصوصی درس

کیسٹ نمبر	تاریخ ریکارڈنگ	پارہ نمبر	سورہ نمبر و نام	آیت نمبر	کیسٹ نمبر	تاریخ ریکارڈنگ	پارہ نمبر	سورہ نمبر و نام	آیت نمبر
۱	۸۱-۷-۱۷	۲۵	۴۳ زخرف	۱۹ تا ۲۵	۱۱	۸۲-۳-۱۹	۲۶	۴۸ الفتح	۶ تا ۱۰
	۸۱-۷-۲۴	//	//	۲۶ تا ۳۲		۸۲-۴-۲	//	//	۱۱ تا ۱۷
۲	۸۱-۷-۲۱	//	//	۳۳ تا ۵۶		۸۲-۵-۷	//	//	۱۸ تا ۲۶
	۸۱-۸-۲۶	۲۴	۴۰ مومن	۶۴ تا ۷۶	۱۲	۸۲-۵-۱۴	//	//	۲۷ تا آخر
۳	۸۱-۸-۲۱	۲۵	۴۳ زخرف	۶۳ تا ۸۰		۸۲-۵-۲۱	//	۴۹ الحجرات	۱ تا ۸
	۹۱-۹-۴	//	//	۸۱ تا اختتام		۸۲-۵-۲۸	//	//	۹ تا ۱۳
۴	۸۱-۹-۲۵	//	۴۴ دخان	۱ تا ۱۶	۱۳	۸۲-۶-۴	//	//	۱۴ تا ۱۵
	۸۱-۱۰-۲	//	//	۱۷ تا ۳۷		۸۲-۶-۱۱	//	//	۱۶ تا آخر
۵	۸۱-۱۰-۱۶	//	//	۳۸ تا آخر		۸۲-۶-۲۵	//	۵۰ ق	۸ تا ۲۵
	۸۱-۱۰-۳۰	//	۴۵ جاثیہ	۱ تا ۱۷	۱۴	۸۲-۶-۲۶	//	//	۲۶ تا ۳۵
	۸۱-۱۱-۱۳	//	//	۲۷ تا ختم		۸۲-۷-۹	//	//	۳۶ تا آخر
۶	۸۱-۱۱-۱۳	۲۶	۴۶ احقاف	۱ تا ۹		۸۲-۷-۱۶	۲۶/۲۷	۵۱ ذاریات	۱ تا ۱۹
	۸۱-۱۱-۲۷	//	//	۱۰ تا ۱۴	۱۵	۸۲-۸-۶	//	//	۱۴ تا ۲۳
	۸۱-۱۲-۴	//	//	۱۵ تا ۱۶		۸۲-۸-۲۱	//	//	۲۴ تا ۴۰
۷	۸۱-۱۸-۱۱	//	//	۱۷ تا ۳۰		۸۲-۸-۲۷	//	//	۴۸ تا آخر
	۸۱-۱۲-۱۸	//	//	۲۴ تا ۲۶	۱۶	۸۲-۹-۳	۲۷	۵۲ طور	۱ تا ۱۶
	۸۲-۱-۸	//	//	۲۷ تا آخر		۸۲-۹-۱۰	//	//	۱۷ تا ۲۵
۸	۸۲-۱-۱۵	//	۴۷ محمد	۱ تا ۴		۸۲-۹-۱۷	//	//	۲۵ تا ۳۸
	۸۲-۱-۲۲	//	//	۵ تا ۷	۱۷	۸۲-۹-۲۴	//	//	۳۸ تا ختم
	۸۲-۱-۲۹	//	//	۸ تا ۱۳		۸۲-۱۰-۱	//	۵۳ النجم	۱ -
۹	۸۲-۲-۵	//	//	۱۴ تا ۱۵		۸۲-۱۰-۸	//	//	۱ -
	۸۲-۲-۱۲	//	//	۱۶ تا ۲۱	۱۸	۸۲-۱۰-۱۵	//	//	۱ تا ۸
	۸۲-۲-۱۹	//	//	۲۲ تا ۳۳		۸۲-۱۰-۲۲	//	//	۹ تا ۱۲
۱۰	۸۲-۲-۲۶	//	//	۳۴ تا آخر		۸۲-۱۰-۲۹	//	//	۱۳ تا ۱۸
	۸۲-۳-۵	//	۴۸ الفتح	۱ تا ۱	۱۹	۸۲-۱۱-۵	//	//	۱۹ تا ۲۵
	۸۲-۳-۱۲	//	//	۱ تا ۵		۸۲-۱۱-۱۲	//	//	۲۶ تا ۳۲

فہرست وڈیو کیسٹس

کیسٹ نمبر	تاریخ ریکارڈنگ	پارہ نمبر	سورہ نمبر/نام	آیت نمبر	کیسٹ نمبر	تاریخ ریکارڈنگ	پارہ نمبر	سورہ نمبر/نام	آیت نمبر
	۸۲-۱۱-۱۹	۲۷	۵۳ النجم	۳۳ تا ۴۳	۲۸	۸۳-۶-۱۰	۲۸	۵۹ حشر	۱ تا ۱۰
۲۰	۸۲-۱۱-۲۶	//	//	۴۴ تا آخر		۸۳-۶-۱۷	//	//	۱۱ تا ۲۳
	۸۲-۱۲-۳	//	۵۴ القمر	۱ تا ۸		۸۳-۶-۲۴	//	//	۲۴ تا ختم
	۸۲-۱۲-۱۰	//	//	۹ تا ۳۲				۶۰ ممتحنہ	۱ تا ۶
۲۱	۸۲-۱۲-۱۷	//	//	۳۳ تا ختم	۲۹	۸۳-۷-۱	//	//	۶ تا ختم
	۸۳-۱-۷	//	۵۵ الرحمٰن	۱ تا ۱۲		۸۳-۷-۲۲	//	۶۱ صف	۱ تا ختم
	۸۳-۱-۱۴	//	//	۱۳ تا ۱۸		۸۳-۷-۲۹	//	۶۲ جمعہ	۱ تا ۸
۲۲	۸۴-۱-۲۱	//	//	۱۹ تا ۳۰	۳۰	۸۳-۸-۵	//	//	۹ تا ختم
	۸۴-۱-۲۸	//	//	۳۱ تا ۴۹		۸۳-۸-۱۲	//	۶۳ منافقون	۱ تا ختم
	۸۴-۲-۴	//	//	۴۹ تا ۵۰		۸۳-۸-۱۹	//	۶۴ تغابن	۱ تا ۶
۲۳	۸۳-۲-۱۱	//	//	۵۰ تا آخر	۳۱	۸۳-۸-۲۶	//	//	۷ تا ختم
	۸۳-۲-۱۸	//	۵۶ الواقعہ	۱ تا ۱۹		۸۳-۹-۲	//	۶۵ طلاق	۱ تا ۸
	۸۳-۲-۲۵	//	//	۲۰ تا ۴۰		۸۳-۹-۹	//	//	۹ تا ختم
۲۴	۸۳-۳-۴	//	//	۴۱ تا ۵۷	۳۲	۸۳-۹-۲۳	//	۶۶ تحریم	۱ تا ختم
	۸۳-۳-۱۱	//	//	۵۸ تا ۷۴		۸۳-۹-۳۰	۲۹	۶۷ الملک	۱ تا ۲
	۸۳-۳-۱۸	//	//	۷۵ تا ۸۲	۳۳	۸۳-۱۰-۱۷	//	//	۲ تا ۶
۲۵	۸۳-۴-۱	//	//	۸۴ تا آخر		۸۳-۱۰-۱۴	//	//	۷ تا ۱۴
	۸۳-۴-۸	//	۵۷ الحدید	۱ تا ۵		۸۳-۱۰-۲۱	//	//	۱۵ تا ختم
	۸۳-۴-۱۵	//	//	۶ تا ۸ ۹ تا ۱۲	۳۴	۸۳-۱۰-۲۸	//	۶۸ القلم	۱ تا ۶
۲۶	۸۳-۴-۲۹	//	//	۱۳ تا ۱۸		۸۳-۱۱-۴	//	//	۷ تا ۴۱
	۸۳-۵-۶	//	//	۱۹ تا ۲۱		۸۳-۱۱-۱۱	//	//	۴۲ تا ختم
	۸۳-۵-۱۳	//	//	۲۲ تا ۲۶	۳۵	۸۳-۱۱-۱۸	//	۶۹ حاقہ	۱ تا ۱۲
۲۷	۸۳-۵-۲۰	//	//	۲۵ تا ۲۶		۸۳-۱۱-۲۵	//	//	۱۳ تا ختم
	۸۳-۵-۲۷	//	//	۲۷ تا آخر			//	۷۰ معارج	۱ تا ۱۸
	۸۳-۶-۳	۲۸	۵۸ مجادلہ	۱ تا ۴	۳۶	۸۳-۱۲-۹	//	//	۱۹ تا ختم
				۵ تا ختم		۸۳-۱۲-۲۳	//	۷۱ نوح	۱ تا ختم
						۸۴-۱-۶	//	۷۲ جن	۱ تا ۱۲

فہرست وڈیو کیسٹس

کیسٹ نمبر	تاریخ ریکارڈنگ	پارہ نمبر	سورہ نمبر معہ نام	آیت نمبر
۳۷	۸۴-۱-۱۳	۲۹	۷۲ جن	۱۶ تا ۲۲
	۸۴-۱-۲۰	//	//	۲۳ تا ختم
	۸۴-۱-۲۷	//	۷۳ مزمل	۱ تا ۹
۳۸	۸۴-۲-۳	//	//	۱۰ تا ختم
	۸۴-۲-۱۰	//	۷۴ مدثر	۱ تا ۶
	۸۴-۲-۱۷	//	//	۶ تا ۲۶
۳۹	۸۴-۲-۲۴	//	//	۲۷ تا ۳۲
	۸۴-۳-۲	//	//	۳۳ تا ختم
	۸۴-۳-۹	//	۷۵ قیامہ	۱ تا ۳
۴۰	۸۴-۳-۱۶	//	//	۴ تا ۳۶
	۸۴-۳-۳۰	//	//	۳۷ تا ختم
	۸۴-۴-۶	//	۷۶ دھر	۱ تا ۹
۴۱	۸۴-۴-۱۳	//	//	۱۰ تا ختم
	۸۴-۴-۲۷	//	۷۷ مرسلات	۱ تا ۱۹
	۸۴-۵-۴	//	//	۱۸ تا ۳۷
۴۲	۸۴-۵-۱۱	//	//	۳۸ تا ختم
	۸۴-۵-۱۸	۳۰	۷۸ نبا	۱ ...
۴۳	۸۴-۵-۲۵	//	//	۱ تا ۲۱

کیسٹ نمبر	تاریخ ریکارڈنگ	پارہ نمبر	سورہ نمبر معہ نام	آیت نمبر
	۸۴-۶-۱	۳۰	۷۸ نبا	۲۲ تا ختم
	۸۴-۶-۸	//	۷۹ نازعات	۱ تا ۵
۴۴	۸۴-۶-۱۵	//	//	۶ تا ۲۶
	۸۴-۶-۲۲	//	//	۲۷ تا ۳۰
	۸۴-۶-۲۹	//	//	۳۱ تا ختم
۴۵	۸۴-۷-۶	//	۸۰ عبس	۱ تا ۱۶
	۸۴-۷-۱۳	//	//	۱ تا ۱۶
	۸۴-۷-۲۰	//	//	۱۷ تا ختم
۴۶	۸۴-۷-۲۷	//	۸۱ تکویر	۱ تا ۷
	۸۴-۸-۳	//	//	۸ تا ۱۳
	۸۴-۸-۱۰	//	//	۱۴ تا ۲۳
۴۷	۸۴-۸-۲۴	//	//	۲۴ تا ختم
	//	//	۸۲ انفطار	۱ تا ۹
	۸۴-۸-۳۱	//	//	۱۰ تا ۱۸
	۸۴-۹-۱۴	//	//	۱۹ تا ختم
۴۸	۸۴-۹-۲۱	//	۸۳ مطففین	۱ تا ۱۳
	۸۴-۹-۲۸	//	//	۱۴ تا ۲۵
	۸۴-۱۰-۵	//	//	۲۶ تا ۳۶

۱۔ پی ٹی وی انٹرویو (غیر نشر شدہ) تین کیسٹس

۲۔ خطاب یوم قائداعظم ۲۵/۱۲/۸۱ تحریک پاکستان کی حقیقی جنگ

۳۔ یوم پاکستان ۲۶/۳/۸۲۔ پاکستان کا تصور کس نے دیا

۵۔ خصوصی درس جشن نزول قرآن۔ قرآن اور سائنس ۳۰/۷/۸۲

۶۔ یوم آزادی ۱۹۸۲ء۔ یہ وہ سحر تو نہیں ہے ۱۳/۸/۸۲

۸۔ (ا) یوم قائداعظمؒ ۲۴/۱۲/۸۲۔ اسلام کے مقابل اسلام

(ب) عید میلاد النبی ۳۱/۱۲/۸۲۔ اسلامی مملکت

۹۔ یوم پاکستان ۲۵/۳/۸۳۔ جو ہو ذوق یقیں پیدا

۱۰۔ یوم اقبال ۲۲/۴/۸۳۔ حقیقت خرافات میں کھو گئی

۱۱۔ جشن نزول قرآن ۸/۷/۸۳۔ ہلال عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے

۱۳۔ (ا) عید میلاد النبی ۱۰/۱۲/۸۳۔ اسلامی نظام قائم کرنے والے لوگ

(ب) یوم قائداعظمؒ ۳۰/۱۲/۸۳

۱۴۔ (ا) پہلا پاکستانی کون تھا۔ یوم پاکستان ۲۳/۳/۸۴

(ب) اخبار نویسوں سے انٹرویو

۱۶۔ یوم آزادی ۱۹۸۴ء۔ جو نہ مانگا وہ ملا جو مانگا نہ ملا

یوم اقبالؒ ۷۔ اقبال اور قیام پاکستان (پی ٹی وی سے باباجیؒ کا انٹرویو)

صراطِ مُستقیم

جب تک مسلمانوں کی فکر و نظر کا محور اور اعمال و افعال کا مرکز، قرآن مجید رہے گا، یہ صحیح راستے سے نہیں بھٹکیں گے۔ اگر انہوں نے اسے چھوڑ کر، انسانی خیالات و نظریات کو اپنے لئے وجہ کشش قرار دے لیا تو پھر انہیں تباہی سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ حضرت عمرؓ اپنے دورِ خلافت میں اس باب میں بہت محتاط رہتے تھے۔ ایک دفعہ ایک شخص آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ امیر المومنین! جب ہم نے مدائن فتح کیا تو میرے ہاتھ ایک کتاب لگی جس میں بڑی اچھی باتیں لکھی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ "کیا قرآن سے بھی زیادہ اچھی؟" اس پر اس نے کہا کہ نہیں! تو آپ نے فرمایا کہ:

"یاد رکھو! تم سے پہلی امتیں اس وجہ سے برباد ہوئیں کہ وہ اپنے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کی کتابوں پر ٹوٹ پڑیں اور خدا کی کتابوں کو چھوڑ دیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ خدا کی کتابیں مٹ گئیں اور اس طرح دین ان کے ہاں سے ضائع ہو گیا۔ تم ایسا نہ کرنا۔"

(شاہکارِ رسالت، ص۳)

قرآن پڑھنا

"ایک وقت تھا جب میں سمجھا کرتا تھا کہ جو شخص بھی قرآن پڑھتا ہے وہ اللہ اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے اس کا طالب بن کر قرآن پڑھتا ہے لیکن اب دیکھتا ہوں کہ بعض لوگ اس لئے بھی قرآن پڑھتے ہیں کہ اس طرح مخلوقِ خدا سے کچھ حاصل کر لیں۔ سنو! قرآن پڑھو تو صرف اجرِ خداوندی کے متلاشی بنو اور اپنے ہر عمل کا مقصود اسی اجر کو ٹھہراؤ۔"

(حضرت عمرؓ)

(جاری ہے)

COMMENTS —

What Al-Razi practiced amounts to murder in the eyes of the Qur'anic law. More-over to advocate early abortion in the cases of small os-uteri is out-dated. Cesarian Section is the answer in modern times. ALI-Ibn al Abbas (d-949-982) States in his book Kitab-al Sina'ah - al - Tabiyyah __ It is necessary to practice abortive medicine in those woman who have a small Pelivis.

COMMENTS—

Again Cesarean is the answer.

Ibn - Sina (d -1037) states in Kitab-al-Qanoon, At times it becoms necessary to induce abortion when the pregnant woman is young and it is feared that child birth would cause her death; when she suffers from a disease of the uterus or when fleshy growth in the uterus make it difficult for the fetus to emerge. Also when the fetus dies in the womb of the mother.

COMMENTS —

Again surgical intervention is the answer.

(Note: This article has been written at the request of Mr Manzoor Ahmed, from Olso, Norway)

LOVERS OF THE HOLY BOOK
ARE REQUESTED TO CONTRIBUTE LIBERALLY
TO KEEP ALIVE THE GIFT SCHEME
UNDER WHICH THE MAGAZINE IS
SUPPLIED FREE OF COST TO ALL
PUBLIC & COLLEGE LIBRARIES
IN THE COUNTRY

Sustainer of the universe has left them by mistake. The real position is that the details of all actions which cannot cope up with the changing times and circumstances have been left out purposely by the one who is Alla-wise. The holy Qur'an says:

"O you who believe! Ask not questions about things which if made plain to you, may cause you trouble. But if you ask about things when the Qur'an is being revealed, they will be made plain to you. Now Allah has forgiven you for what has happened before, Allah is often forgiving and most for-bearing. Some people before you did ask questions and on that account lost their Eiman". (5:101:102)

In the above said verses the believers are warned not to probe in to what has not been revealed. If the details of each and every act are given to you, these details shall be considered to be immutable; and in the event of their conflict with the needs of changing times, you shall be put in to difficulty. It is only the principles laid down in the Qur'an which are immutable, the patterns, in which these principles are practiced, go on changing with the change of time and circumstances. Thus probing in to these patterns or these details is prohibited. The Qur'an says that Israelties had begun to ask such questions to Moses (2:108). That resulted in putting all sorts of bindings and restrictions upon themselve, but they failed to abide by them. And when they found this unchangable shari'at impracticable, they repudiated their Deen itself.

ABORTIONS IN THE LITERATURE OF RENOUNED MUSLIM PHYSICIANS OF THE PAST.

Muslim physicians of the past did carry out abortions, but these can not be considered to intervene in the Islamic law for fetuside. AL-RAZI (d-923) has referred to abortions in his book HAWI. Supporting the Heppocrates version he states __ abortive medicines should be used before child birth, in the event that the pregnant woman was a virgin who was prematurely deflowered and became pregnant in a tender age. Abortion of the Fetus should be carried out before it grows big, otherwise the pregnant woman would die. Any woman the condition of whose os-uteri was small, will die if the fetus were to reach the full term.

money as compensation (4:92). If the heirs of the murdered person, voluntarily or out of good will forego the money or part thereof, they have the right to do so (17:25). In this event, it is necessary that the wrong doer, carry out the terms of the agreement faithfully and with grace.

The Qur'anic laws and injunctions, described above, in relation to murder shall serve as a guide line for making decisions, by the law-courts of an Islamic state, while taking up the cases of fetuiside.

"Allah's laws based on the truthand justice have been set forth in this book (the Qur'an) in complete form. None has got the authority to make any change in these laws" (18:27)

"Say: 'Shall I seek for Judge other than Allah __ when He it is Who has sent un-to you the book explained in detail." (6:114)

Thus the guidance of the Qur'an is complete in all respects. Certain injunctions of the Qur'an are in the form of definite laws. These are mainly concerned with the Family life. For the rest only the fundamental principles are given. As regards punishments for crime, it is only for certain crimes that punishments are laid down; for the rest it has been left for the Islamic states of different ages to prescribe punishments according to the existing circumstances of their respective age and with respect to the individual nature of such cases; however, remaining withen the boundary line of the basic principles laid down in the Qur'an. As such the Qur'an serves as a practical guide for humanity in all ages. The punishments prescribed by the Muslim Jurists of the past, for fetuside are not in consonance with the circumstances of the present age. These are mostly outdated. The circumstances have changed drastically since these were introduced. For example freeing the slaves as a punishment and the amounts of cash to be paid, etc can not be applicable to the present age. It is for the modern Muslim lawyers and Judges to help the state in making fresh by-laws, within the boundry line of the Qur'anic fundamentals; of course under consultation with the Qur'anic scholars of repute.

ISLAMIC SOCIAL ORDER A BEAUTIFUL BLEND OF PERMANENCE AND CHANGE

If instructions in black and white, regarding punishment ffor fetuside arenot to befound in the Qur'an, it does not mean that (God forbid) the

those who find it beyond their means, (is prescribed) a fast for two months running by way of repentance to Allah, for Allah has all knowledge and all wisdom." (4:92)

"O yon who believe! the law of equality is prescribed to you in cases of murder, the free for the free, the slave for the slave, the woman for the woman. But if any remission is made by the brother of the slain then grant any reasonable demand and compromise him with handsome gratitude. This is the concession from your Sustainer, so that your potentialities may continue to grow. After that whosoever shall exceed the limit, shall be in grave penalty." (2:178)

"The recompense of an injury is an injury equal there to (in degree) but if a person forgives and makes reconcilliation, his reward is due from Allah, for Allah loveth not those who do wrong." (42:40)

"If you reflect deeply, it will become clear to you that the law of Retribution provides protection for your individual as well as for collective life (2:179)

"The punishment for murder shall be given to the murderer and not to anybody else. (2:178)

Let us summarise the Qur'anic law for murder stated above;-

1. It is evident from the above said verses that the punishment for murder is awarded to individual wrong doers because without this safegaurd the human life which is very valuable would not remain safe. The law is that the murderer should be considered as the one who commits a crime against the society as a whole.

2. In awarding punishment the basic principle of Justice and also of Equality must also be kept in view and no distinction should be made between the great and the humble: what ought to be considered is not the status of the murderer or of the murdered but the principle of Justice, regarding which all human life is equally valuable.

3. Murder can be with or without intent. In the former case the punishment is death (not ransom money), or depending upon the nature of the crime as mentioned above in (42:40) and (17:33)

4. In the case of an un-intentional murder the punishment is payment of

result of some drug taken by the woman herself voluntarily. Or she might seek the help of a physician to get her uterus evacuated. Abortion might occur as the result of some body striking at the belly of a pregnant woman. The pregnant woman might starve herself to cause abortion.

Thus the judges shall have to probe the crime thoroughly before making decisions.

THE QUR'ANIC LAW

The sanctity of Life:__ "If any one kills another person, except as punishment for murder or for spreading disorder in the land, it shall be as if he has killed the whole of mankind. On the other hand if one saves the life of a single person, it shall be as if he has saved the lives of entire mankind." (5:32)

"Do not take the life of any human being, the life which Allah has sanctified __ otherwise than in the persuit of Justice." (16:152)

"Do not take life which Allah has made sacred except for a just cause. And if any body is slain wrongfully, We have given his heirs authority (to demand قصاص 'Qisas' or to forego) but let him not exceed bounds in the matter of taking life, for he is helped (by the law). (17:33)

Accordingly, it is the duty of an Islamic State only to punish the murderer.

"Do not slay such life as Allah has made sacred, except for a just cause, nor commit fornication, and any that does that shall meet the punishment." (25-68) The word بالحق in this verse means 'according to the divine law', as in the case of murder or spreading disorder in the land.

The punishment differs in cases of (قتلِ عمد) wilful murder, from that of (قتلِ خطا) murder by mistake __

"A believer should not kill a believer (but if it so happens) by mistake (compensation is due). If one (so) kills a believer, it is ordained that he should free a believing slave and pay compensation to the deceased's family unless they remit it freely. If the deceased belonged to a family at war with you and he was a believer, the freeing of a believing slave (is enough). If he belonged to a people with whom you have a treaty of mutual alliance, compensation should be paid to his family, and a believing slave be freed. For

Fetuside amounts to ending the life of a living being. Thus the Qur'anic law on murder shall form the boundry line while deciding the cases of fetuside.

PHILOSOPHY OF CRIME AND PUNISHMENT IN THE HOLY QUR'AN

The Qur'anic injunctions and laws deal with morality as well as with crime. For example (47:37) لاتمش فی الارض "Do not walk on the arth with insolence". This is an injunction of moral nature. Walking with insolence does not affect the society. On the other hand (17:32) ولا تقربوا الزنی "Do not come near adultery." It is apparent that adultery is a social problem and a crime of social nature. However, the above-said division is arbitrary, because the basis of all Qur'anic injunctions is to improve the morals, and morals mean the nourishment of human personality.

The Qur'anic laws relating to crime are also of two kinds. (1) Those for which the punishment is prescribed by the Qur'an itself and (2) those in which the punishment has not been prescribed, but is left for the Islamic state, in order to enforce it according to the existing circumstances. For example the consumption of wine is a crime for which no punishment is prescribed. On the other hand, it is of utmost importance to point out that those acts for which punishment is not prescribed by the holy Qur'an, can be included in the list of crimes. It is apparent that it is not for the individuals to do so; but it is rather the duty of an Islamic State. As the nature and circumstances of such cases differ in individual cases, the pnishment shall remain changable. However, the principles laid down by the Qur'an are immutable and all decisions shall have to remain within the four walls of these principles.

THE QUR'ANIC LAW FOR MURDER

After the above-said introductory remarks now let us state the Qur'anic Law for murder which shall provide the guide line to decide the cases of Fetuside which is also a murder.

Aggression against the fetus implies any action which leads to the separation of Fetus from the mother. As described earlier such an action may be committed in various ways. It may be committed by the pregnant woman herself or may be committed by a second person. It might be the result of rebuke, for instance one may threaten to kill her. It may be the

The value of Al-Ghurrah is 1/20th of the Diyyah (full blood money). It may be in the form of sheep, camels, or cash.

COMMENTS:

To begin with let us cast a glance at the poor nature of the Hadis described above when Hazrat Omer consulted his companions. Can the consultation of this nature form the basis of a law. The above-said Jurists are deeply involved in the fictitious issue of ensoulment which is merely a flight of imagination. After all what is this ensoulment? What are the means at your disposal to ascertain that ensoulment has taken place. and when? Does ensoulment indicate some physical. mental or psychological changes in the fetus or is it some separate entity? If so, what makes you certain that ensoulment has taken place at such and such a period of intrauterine life. On the other hand, by no means one can deny the fact that from the stage of the fertilisation of an ovum, till the birth of a child, it is a continuous living organism.

On the other hand, the payment of Al-Ghurrah the lesser blood money or Diyyah the full blood money, without the prior decision as to whether the aggression on the fetus is wilful (قتلِ عمد) or by mistake (قتلِ خطا) is an open violation of the Quranic law which I shall describe soon in detail. I have described earlier the difference between 'life' and 'soul' and also the nature of what is 'Ruh' or soul, as laid down in the Qur'an. The determination of the time of enssolement as described in the above-said Ahadis is a mere speculation without any solid basis.

On the other hand, as described above according to the Hanfi School, if the fetus, separated from its mother's body during the 6th month of pregnancy then the 'Diyyah Kamila' (دیت) is due instead of 'Ghurrah' But they do not fix the timings of 6 months on the basis of ensolement, but on the basis of the viability of fetus. This they hold can only be when the fetus is 24 weeks old. May I point out that the determination of the time of viability by the above school is a mere speculation. Viability means the capability of maintaining a separate existence. The abstetrician's life long experience shows that 28 weeks is the earliest period at which a newly born infant has got the rare chance of survival (obstetries by ten teacher's 12th Editor __ 1976)

QURANIC INJUNCTIONS IN MURDER CASES

Diyya Kamila (the full blood money) in compensation (not Ghurrah). However the Hanfi School holds that only if the fetus is separated from its mothers body during the sixth month of pregnancy only then the Diyyah Kamila shall be due (instead of Ghurrah). This school, however, does not deny that the ensolement does take place after the fourth month of pregnancy. But its criterian for determining the time when the full blood money will be due as the result of aggression against the fetus is not ensolement, but rather the period during which the fetus would be regarded viable. This it holds, can only be when the fetus is in its 24th week. Payment of Diyyah may be made to the family of the deceased fetus in the form of 100 camels or 200 cattle or 1000/- dinors or 12000/- Dirhams.

AL-GHURRAH __ The Shariah prescribes another punishment for Fetuside known as Al-Ghurrah. It means a precious thing, camels, horses of good breed. In some dictionaries it means a white slave. The penalty for fetuside that is called Al-Ghurrah is the lowest rate of blood money.

Hazrat Mughira bin Sha'ba relates __ Hazrat Umar consulted 'Sahaba' (companions) regarding punishment for fetucide. Mughira said the Rasool (Peace be upon him) had ordained, one slave male or female to be given. Hazrat Umar ordered Mughira to bring forward a proof of it and not to leave until he does so. In the mean time Hamd bin Muslima came who confirmed it.

In القصاص فی الفقہ اسلامی published by the Research Centre Dyal Singh Trust Library Lahore, one finds scores of discussions on the subject of Al-Ghurrah On the basis of Ahadis, the Muslim Jurists consider the payment of Al-Ghurrah necessary for all cases of aggression on the fetus. However, there is a difference of opinion as to whether it is necessary to fulfil the obligation, in the event that the fetus upon whom the aggression is made, separates from the mother's body while still in an unformed state.

Imam Malik holds that the Ghurrah is to be paid although the fetus be in an unformed state . Imam Abu Hanifa and Al-Shafis are of the openion that is to be paid, as long as whatever, comes out of the woman's body can be made out to be the beginning of human creation. The Humbli School is of the opinion that if any act to terminate the pregnancy he carried out before 40 days after following pregnancy, then the payment of Al-Ghurrah is not necessary.

The fear is that the existing infant shall die. In that respect the woman would be permitted to abort the fetus for the sake of survival of the existing infant.

COMMENT:

It is apparent that the above said argument to abort the fetus is most flimsy. An artificial feeding can easily replace the breast feeding.

Secondly it is said that abortion may be allwoed if mothers life is in danger. This assertion is vague because the problem is medical rather than ethical and the case needs a thorough investigation before abortion is allowed.

MALIKI SCHOOL __ It is not permissable to induce abortion once the semen has been retained in the womb, though if would be before 40 days after pregnancy. After ensolement abortion is prohibited absolutely (haram).

SHAFI SCHOOL __ Imam Ghazali in his "Ihya 'ulum al Deen" States that the contraception is not like abortion or wad (burrying the infant girl alive); because abortion is a crime against an existing being. Existence has stages. The first stage is the setting of the semen in the womb and its mixing with the secretions of the woman. (Note it is a vague assumption. Pregnancy is not the result of mixing male and female secretions. It is rather the result of the fertilisation of ovum by the spermatazoa. Ovum is not the part of a secretion.) It is then ready to receive life. Disturbing it is a crime. When it acquires a sole and its creation is completed, the crime becomes grievous. The crime reaches maximum seriousness when it is comitted after the fetus is separated from the mother alive.

It is apparent that the stages described above are arbitrary. The embryo and the fetus are a living organism, right from the beginning to the end of intrauterine life.

HAMBLI SCHOOL __ Ibn e Qudama, in his Al-Mughni sStates:__ whoever hits the belly of a pregnant woman and she aborts, then he/she has to give blood wit (دیت) . Likewise if a pregant woman drinks a medicine which results in her aborting the fetus, she has got to give a blood wit.(دیت) The Diyyah Kamila (the full blood money):- Muslim Jurists hold that the fetus is ensoled after the 4th month of pregnancy. Hence it follows that any act of aggression against the fetus after the 4th month would be tentamount to taking the life of a human being. Thus the aggressor would be liable to pay

higher among offsprings of consanguineous as compared with Non-consanguineous marriages. (Consanguinity means blood relationship __ marriages between cousins). The most significant of these was the occurrence of Down ssyndrom (Mongolism or Mongolian Idiocy) Mongolian idiocy may occur on account of advanced maternal age, as discovered by researchers in Canada.

A Hadis in this respect is as follows — Marry from afar, to avoid weak progeny and young men who could support a wife, should marry."

The remedy to avoid the occurrence of Mongolian idiocy can be the counselling to such parents to use contraceptive devices so as to avoid the birth of idiotic children. However,, the life span of grossly deformed fetues is naturally short.

The question whether abortion in cases of deformed fetuses can be allowed from the Islamic point of view? The Fatwa from the Darul Ifta Riadh is there. But would it not be fair to allow early abortion in case of those women in which the deformity has been detected by bio-medical means?

Such issues on which the Qur'an is silent, are required to be solved by an Islamic state by mutual consultation, of course by giving priority to medical opinion. The consensus of medical opinion shall go in favour of abortion in definitely diagnosed cases of malformations.

For example take the case of maternal Rubella or German measles which is a virus disease. It is contracted by a pregnant woman during her first trimester and may lead to the child manifesting certain malformations at term, such as cataract, deaf mutism, heart lesions or dental defects etc. Or take the case of an early diagnosed hydrocephelic fetus which can cause difficulty during birth and whose life span after brith is very short. Thus in the case of early diagnosed malformed fetuses the situation is quite different from the cases of formication, adultery and rape. These cases are related more to medical problems rether than to ethics.

VIEWS OF MUSLIM JURISTS ON ABORTION

Hanfi School __ A valid reason for an abortion to be allowed before the 4th month of pregnancy is the case of the presence of a nursing infant. The new pregnancy sets up an upper limit, in the event that there is no possibility of getting a wet nurse to breast feed the already existing infant.

It is not for an individual to proclaim catagorically as to how such cases should be dealt with. It is for the centre of an Islamic State to provide by-laws with the aid of legal experts.

Yet one is inclined to State that in proved cases, especially when illegitimate pregnancies are the result of rapes committed by foreign invaders, abortion ought to be allowed.

DEFORMED FETUSES.

With the advances in the Biomedical technology parental diagnosses can today be safely carried out with considerble accuracy. The techniques used in such cases are.

(1) Amniocentecis. (2) Fetoseopy (3) Ultrasound and (4) X-Ray.

Muslim Jurists are now confronted with the question as to whether abortion is permitted in the event that:

1 There is a possibility of the Fetus being born with a genitically transmitted disease.

2. A congenital defect is feared or suspected

3. An intrauterine diagnoses of a severe fetal abnormality incompatible with life is made

A Fatwa by Darul - Ifta Riyadh states categorically that abortion on such grounds could not be permitted.

What are the reasons behind this Fatwa and whether it was issued after medical consultation is not known.

Diseases or factors which affect Fetal life __ The children born to parents who habitually take alcohal are often mentally retarded. A child born to a mother who is infected with sexually transmitted diseases (STD) may loose his eyesight or suffer from brain damage. The sexually transmitted diseases are of various types. The newly born child may be suffering from neonatal or life-threatening herpes which can cause permanent brain damage in those infants who survive the disease.

Dr. Omer S Alfi who undertook to study Fetal deformity in Kwaity Society discovered that the frequency of genetic disorders were significantly

During the partition of India in 1947, a number of pregnancies were noted amongst Muslim women, assaulted by Sikhs and Hindus. The number of such unfortunate women in Bosnia and in Kashmir has reached to thousands and a large percentage of them became pregnanct and gave birth to illegitimate children. The question arises is abortion in such cases justified, because the women are violated against their will.?

Rape is both a psychological emergency as well as a medical emergency. It needs treatment of physical injuries, crises intervention with emotional support, prophylaxis of venereal disease and medical intervention to check pregnancies. Immediately after the sexual act has taken place it is not possible to establish if pregnancy has occurred. Hence at that point of time it would be permissable to check pregnancy by taking medicines or by means of douche etc. But the cases which do not report immediately for medical aid and report after weeks and months, it would not be justified to advocate abortion, for then it would be difficult to establish medically whether rape has taken place or the case is of wilful adultery or fornication. Yet in Muslim countries or environments it is not so easy for victims of rape, to report its occurrence, for fear of being ostracised. Although it may not be fair to cut of such a woman from the society, yet the tendency does exist to look down upon her and even her chances of getting married would be jeoperdised.

Thus the question arises as to what should be done in such cases?

1. From the medical point of view it is not possible for a doctor to decide with certainty whether such a case is of rape or wilful adultery?
2. Is it fair for the woman to carry the pregnancy to term, because the child to be born shall carry the stigma of being illegitimate?
3. Supposing a married woman is raped while her husband is away or is temporarily living in some other country, would the husband accept that his wife may carry some one else's child in her womb?
4. Moreover, would it he comfortable for the woman to carry on to full term?

Finally what shall be the position in the cases of rape where the women are assaulted forcibly by military personal of the invading army such as is the case in Kashmir and Bosnia these days ?

ABORTION

By

Dr. Syed Abdul Wadud

The first portion of this article was published in July 93 issue of Tolu-e-Islam Magazine, in which the author had written on the following topics:

1. Abortion,
2. Fetus and Muslim Jurists,
3. Ensolement of the Fetus,
4. Unwanted Pregancies,
5. The Jewish Laws for adultry and
6. Islamic Law. Editor

RAPE AND PREGNANCY

Rape is unlawful sexual intercourse with a woman without her consent.

To begin with it is important to realise that although rape in itself is a sexual crime, it differs from fornication and adultery in that it is associated with force and violence and the woman is not a wilful partner. Rape is a frequent occurrence in the west especially in the United States. In 1977, 63020 cases were estimated. The Sunday Tribune of Nov. 1983 reported that it was then estimated that in a year 300,000 women would be raped in South Africa. That was confirmed in 1984. The reason for it being that the films partraying cruelty and violence towards woman, arouse nearly a third who watch them.

It is said that pregnancy as the result of rape is unlikely. Of the past decade's growing medical literature on sexual assault, several investigaters have documented that pregnancy in such cases vary from 0 to 2.2 per cent of the victims involved. However, inspite of this documentory evidence in these research centres, pregnancy can not be ruled out in cases of rape.